ہمدرد نونہال

ستمبر ۱۹۶۵ء

مدیر اعلیٰ: حکیم محمد سعید

مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۹ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

ہمدرد نونہال

جاگو، جگاؤ

اعتدال اور توازن بڑی اچھی چیز ہے۔ ہر کام میں بیچ کا راستہ اچھا ہوتا ہے اور انتہا پسندی کسی کام میں بھی مناسب نہیں ہوتی، اس لیے جو کام بھی کیا جائے، سوچ سمجھ کر کیا جائے اور اس میں بیچ کا راستہ، یعنی راہِ اعتدال اختیار کی جائے۔ اعتدال اپنی جگہ ایک خوبی ہے۔

حکیم محمد سعید

قیمت:— ایک رسالہ: ۷۵ پیسے —— سالانہ: آٹھ رُپے

کھیل

عابد نظامی

منّو - چنّو - نمّو - کمّو
آؤ کھیلیں کھیل
مل کر ایک قطار بنائیں
بن جائے اک ریل

منّو خاں بن جائے انجن
باقی سارے ڈبّے
پیارا پیارا سا انجن ہو
پیارے پیارے ڈبّے

چھک چھک - چھک چھک - چھک چھک - چھک چھک
چلتی جائے ریل
کوئی اسے پسنجر سمجھے
کوئی سمجھے میل

منّو - چنّو - نمّو - کمّو
آؤ کھیلیں کھیل

دو دشمن کتّے

میرزا ادیب

ایک امیر شخص کے پاس دو کتّے تھے۔ اِن دونوں سے وہ بڑی محبت کرتا تھا۔ دونوں کتّے جس قدر خوب صورت تھے، اُسی قدر طاقت ور بھی تھے۔ اپنے مالک کا کہا بھی مانتے تھے اور گھر کی حفاظت بھی کرتے تھے۔ سب خوبیاں تھیں اُن میں، مگر ایک بُرائی بھی تھی اور وہ یہ کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک کتّا دوسرے کتّے کو دیکھ لیتا تھا تو چاہتا تھا فوراً بھاگ کر اُس پر حملہ کر دے اور یہی حال دوسرے کتّے کا بھی تھا۔ دونوں آپس میں بڑے دشمن تھے۔ اِس لیے اِن کا مالک اِنھیں الگ الگ باندھتا تھا اور ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتا تھا تاکہ آپس میں لڑکر نہ مرجائیں۔

ایک دِن کا ذکر ہے کہ اُس آدمی کا نوکر کتّوں کو الگ باندھنا بھول گیا۔ اب کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے اور لہو لہان ہو گئے۔ اگر مالک نہ آجاتا تو ضرور لڑ لڑکر مرجاتے! کتّوں کی یہ دُشمنی دیکھ کر اِن کے

مالک کو بڑا افسوس ہوا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا طریقہ اختیار کرے کہ دونوں کتے آپس میں لڑنا چھوڑ دیں اور ایک دوسرے کے دوست بن جائیں۔ اس طرح تو ان کا ایک گھر میں رہنا بڑا مشکل تھا۔ کئی بار دونوں ایک دوسرے کے سامنے ہو جاتے تھے اور زنجیر توڑ کر ایک دوسرے کو مار ڈالنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

امیر آدمی کے محلے میں ایک بوڑھا رہتا تھا۔ محلے والے اپنے خاص معاملات میں اُس سے مشورہ لیا کرتے تھے اور وہ جو مشورہ بھی دیتا تھا، بڑا فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ امیر آدمی بھی اس کے پاس پہنچا اور بولا، "باباجی! میں کیا کروں! میرے کتے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ ہر وقت انھیں الگ الگ باندھنا پڑتا ہے۔ اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے!" بوڑھا کہنے لگا، "یہ تکلیف دور ہو سکتی ہے!"

"وہ کس طرح؟"

امیر آدمی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

بوڑھا بولا، "کل آنا! میں تمھیں ایک طریقہ بتا دوں گا۔ اُس پر عمل کرنا دونوں کی دشمنی ختم ہو جائے گی اور آپس میں یہ دوست بن جائیں گے۔"

یہ بات سن کر امیر آدمی اپنے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن وہ بوڑھے کے یہاں پہنچا۔ بوڑھے نے اسے ایک تجویز بتا دی اور امیر آدمی خوش خوش اپنے گھر چلا آیا۔

صبح ہوئی تو امیر آدمی اپنے دونوں کتوں کو ساتھ لے کر جنگل میں پہنچ گیا۔ ایک کتے کی زنجیر ایک درخت سے باندھ دی اور دوسرے کی زنجیر ہاتھ میں لے کر ایک طرف جانے لگا۔

ابھی کچھ دُور ہی گیا ہو گا کہ ایک بھیڑیا آتا دکھائی دیا۔ امیر آدمی نے کتے کی زنجیر ہاتھ سے چھوڑ دی اور خود ایک جگہ بیٹھ گیا۔

بھیڑیے نے جو کتے کو دیکھا تو بھاگا اُس کی طرف۔ اُدھر کتا بھی بھیڑیے کی طرف بڑھا اور دونوں کی لڑائی ہونے لگی۔

کتا بڑا طاقت ور تھا، مگر بھیڑیا بھی کچھ کم نہیں تھا، بلکہ اُس کے دانت زیادہ تیز تھے۔

دونوں کی کوشش تھی کہ ایک دوسرے کو مار ڈالیں۔ کبھی کتا بھیڑیے کو دبا لیتا اور کبھی بھیڑیا کتے کو امیر آدمی دور بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

بھیڑیے کو جب غصہ آیا تو اس نے پیچھے ہٹ کر بڑے زور سے کتے پر حملہ کر دیا۔ کتا اس حملے کے لیے پہلے ہی تیار تھا، لیکن زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔

بھیڑیے نے اُسے بری طرح زخمی کر دیا۔ اب کتے میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کا سارا جسم زخمی ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھیڑیا اسے چیر پھاڑ دے گا کہ امیر آدمی نے درخت سے اپنے دوسرے کتے کی زنجیر بھی کھول دی۔

کتا بھیڑیے کی طرف دوڑا۔ بھیڑیے نے دوسرے کتے کو آتے دیکھا تو ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا، مگر کتے نے اُسے بھاگنے نہ دیا اور اس پر کود پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ بھیڑیا طاقت ور تھا، لیکن اب تھک چکا تھا۔ کتا تازہ دم تھا اور اپنی پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

لڑائی ہونے لگی۔ ہوتی رہی۔ ہوتی رہی۔ آخر بھیڑیا اس قدر زخمی ہو گیا کہ اُس میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہ رہی زمین پر گر گیا اور تھوڑی دیر بعد مر گیا۔

دونوں کتے ایک ساتھ مالک کی طرف آ گئے۔

اب سنو بچو! ان کا تو پہلا طور طریقہ ہی بدل گیا۔

پہلا کتا دوسرے کتے کی طرف اس طرح دیکھتا تھا جیسے اُس کا احسان مند ہو اور دوسرے کتے نے اُس پر احسان بھی تو کیا تھا۔ اگر وہ بھیڑیے کا مقابلہ نہ کرتا تو بھیڑیا پہلے کتے کو تو ضرور بالضرور مار ڈالتا۔ اس کے بعد وہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہ لڑے۔ ایک ساتھ رہتے تھے۔ ایک ساتھ کھاتے تھے اور ایک ساتھ گھومتے تھے۔

لطیفہ

احمد: کل محمود نے تو کمال کر دیا، اس نے ایک بھاگتے ہوئے گھوڑے کو ایک ہاتھ سے روک لیا۔

اعجاز: اس میں کمال کی کیا بات ہے، میں نے کل ہاتھ کے ایک اشارے سے چلتی بس کو روک لیا تھا۔

(نذیر احمد)

خوشی کا کھیل

کسی قصبے میں ایک غریب خاندان بستا تھا۔ اس چھوٹے سے کنبے میں ایک میاں، ایک بیوی اور ان کی ایک چھوٹی سی بچی شامل تھے۔ لڑکی ننھی منی اور پیاری پیاری سی تھی۔ اس کا نام شوشو تھا۔ شوشو ابھی چھوٹی سی تھی کہ اس کی ماں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ وہ روتی دھوتی رہ گئی۔ اس کا باپ اکیلا اسے پال پوس کرتا

وہ دن رات محنت مزدوری کرکے جو کچھ کماتا اس سے اپنا اور منی بیٹی کا گزارا کرتا۔ ننھی شوشو بہت نیک لڑکی تھی اتنی اچھی کہ قصبے کے سارے لوگ اس سے پیار کرتے۔ شوشو کے والد بہت محنتی اور ایمان دار آدمی تھے۔ انھوں نے شوشو کو لکھنا پڑھنا بھی سکھایا۔ جب وہ امیر آدمیوں کے بچوں کے پاس

کوئی اچھی چیز یا کھلونا دیکھتی اور اپنے
باپ سے فرمائش کرتی کہ مجھے بھی لا دیں
تو اس کا باپ اسے بڑے پیار سے بہلا دیتا۔
باپ نے شوشو کو ایک ایسا کھیل سکھایا
جسے وہ خوشی کا کھیل کہتی تھی۔ وہ کھیل
یہ تھا کہ جب ہمیں کسی ایسی چیز کی
خواہش ہو جو نہ مل سکے تو یہ سمجھنا
چاہیے کہ اس کا نہ ملنا ہمارے لیے
بہت اچھا ہے۔ اللہ میاں نے اس میں
کوئی بہتری رکھی ہے۔ اگر ہمیں وہ
نہ ملے تو ضرور ہماری بھلائی ہے اور
ملنے میں کوئی تکلیف ہوتی، مثلاً ایک
مرتبہ برسات کے موسم میں شوشو کا
جی چاہا کہ وہ آم کے درخت میں
جھولا ڈالے اور اپنی ساتھی لڑکیوں
کے ساتھ جھولے۔ اس نے اپنے ابا
سے رسّی لانے کو کہا، مگر اس کے پاس
تو ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ وہ بے چارا
کہاں سے لاتا۔ جو مزدوری ملتی اس
میں کھانے پینے کا گزارا بھی مشکل سے
پورا ہوتا۔ جب جھولے کے لیے رسّی
نہ ملی تو شوشو کی سہیلیوں نے کہا کہ آؤ
کنوئیں کے ڈول کی رسّی لیں اور اس کا
جھولا ڈال کر جھولیں۔ سب نے مل کر
یہی کیا اور جھولنے لگیں، لیکن ڈول
کی رسّی اتنی مضبوط نہ تھی۔ وہ ٹوٹ
گئی اور شوشو کے گر کر خوب چوٹ
لگی۔ اس وقت اس نے اپنی سہیلیوں
کو بتایا کہ دیکھو ہم نے اپنے ابا کا
کہنا نہ مانا انھوں نے سچ کہا ہے کہ
ہمیں اپنی منھ مانگی چیز نہ ملے تو
سمجھنا چاہیے کہ اس میں ہماری بھلائی
ہے۔ ہم نے ضد کر کے یہ جھولا ڈالا
اور چوٹ کھائی۔

اس طرح شوشو نے خوشی کا یہ
انوکھا کھیل اچھی طرح کھیلنا شروع کیا
اور اس کے ساتھ ساری سہیلیاں
بھی اسی کے کہنے پر چلنے لگیں۔ سب
نے ہر حال میں ہنسی خوشی رہنا سیکھ
لیا۔ قصبہ بھر کے چھوٹے بچے اور
بچیاں شوشو کو اپنی اُستانی مان کر
اس کے سکھائے ہوئے کھیل کو کھیلتے
اور خوش رہتے۔ کوئی بھی کسی ایسی
چیز کے لیے اپنے والدین سے ضد نہ
کرتا، جو انھیں اپنی مرضی کے مطابق
کبھی نہ مل سکتی۔ اس لیے بڑے اور

بچے سب ہی شوشو کی تعریف کرتے اور اس سے خوش رہتے۔

کچھ دنوں بعد خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شوشو کا باپ بہت بیمار ہو گیا اور ننھی بیٹی کو روتا چھوڑ کر اللہ کو پیارا ہوا۔ قصبے کی بڑی بوڑھیوں نے شوشو کو تسلی دی اور اسے بتایا کہ اللہ میاں نے اس کے باپ کو جنّت کی رکھوالی کے لیے اپنے پاس بلا لیا ہے، کیونکہ وہ بہت نیک اور اچھا آدمی تھا۔ تم صبر کرو اور آرام سے رہو اس میں بھی خدا کی طرف سے کوئی بہتری ہو گی۔ شوشو کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ اس کا باپ جنّت کا رکھوالا ہے اور اللہ میاں اس سے خوش ہیں، مگر جب وہ یہ سوچتی کہ اس بھری پُری دُنیا میں اکیلی رہ گئی، اس کا کوئی سہارا نہیں ہے تو اسے دُکھ ہوتا پھر صبر کر کے رہ جاتی۔

ننھی شوشو کی ایک پھوپھی تھی۔ وہ شہر میں رہتی تھی اور بہت امیر تھی اس کا خاوند مر گیا تھا۔ اس کی ساری جائداد اسے مل گئی۔ وہ دولت سے بہت پیار کرتی اور بڑی کنجوسی سے رہا کرتی۔ بہت دنوں سے شوشو کے باپ اور اس کی پھوپھی میں ان بن تھی۔ جب قصبے کے لوگوں نے شوشو کی پھوپھی کو خبر کی کہ اس کا نیک بھائی دنیا سے سدھار گیا اور اس کی ننّھی بھتیجی اکیلی رہ گئی تو اس کا دل پسیجا اور روتی دھوتی وہاں آئی اور شوشو کو اپنے ساتھ لے گئی۔

جب پھوپھی ننّھی بھتیجی کو لے کر اپنے گھر پہنچی تو اس کے سب نوکر چاکر حیران ہوئے، کیوں کہ پھوپھی بوڑھی ہو گئی تھی، مگر کسی سے ملتی جلتی اور سیدھے منھ بات بھی نہ کرتی تھی۔ وہ یہ سوچتی کہ کسی سے میل جُول تو مفت میں اُن کی خاطر مدارات کرنی پڑے گی اور خرچ بھی کرنا ہو گا، اسی لیے وہ سب سے الگ تھلگ رہتی۔

شوشو اس گھر میں آئی تو اس کی پھوپھی نے اسے اپنے عالی شان مکان کے ایک حصّے میں چھوٹی سی کوٹھری رہنے کو دے دی۔ نوکروں کو شوشو پر بڑا ترس آیا کہ یہ بے چاری ننّھی سی بچی اس کوٹھری میں اکیلی رہے گی، مگر شوشو نے

اس کوٹھری کو خود اچھی طرح صاف ستھرا کیا۔ اپنا بستر لگایا اور ہنسی خوشی رہنے لگی۔ اس نے اپنی پھوپھی سے خوش ہو کر کہا، "پھوپھی جان! یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے علیحدہ یہ کوٹھری دی۔ میں آرام سے یہاں رہوں گی اور سب سے الگ تھلگ لکھتی پڑھتی رہا کروں گی۔" پھوپھی اس کی یہ بات سن کر حیران ہوئی کہ یہ چھوٹی سی لڑکی بھی عجیب ہے۔ پھر شوشو نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس کے باپ کو اللہ میاں نے اپنے پاس اس لیے بلالیا کہ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، محنت مزدوری سے انھیں دکھ ہوتا اور نہ کرتے تو مجھے کہاں سے کھلاتے اب وہ وہاں چین سے رہتے ہوں گے اور میں یہاں اپنی پھوپھی کے پاس آرام سے رہتی ہوں۔ وہ کبھی پھوپھی سے کوئی چیز، کپڑا یا کھلونا لانے کو نہ کہتی اور دن رات لکھتی پڑھتی۔ اب وہ مدرسے بھی جانے لگی تھی اور وہاں اپنی جماعت کی لڑکیوں کے ساتھ مل جل کر ہنسی خوشی رہنے لگی۔ اُستاد اور لڑکیاں سب اس کی اچھی عادتوں سے اسے پیار کرتے۔

اس کی پھوپھی جب نوکروں کو گھر کے کام کاج میں ڈانٹتی اور بُرا بھلا کہتی تو انھیں دُکھ ہوتا۔ اس وقت ننھی شوشو ان کو تسلی دیتی اور کہتی،

"پھوپھی جان تمھیں بُرے دل سے نہیں ڈانٹتی ہیں وہ تمھاری بھلائی کے لیے سب باتیں کرتی ہیں کہ تمھیں ٹھیک کام کرنے کی عادت ہو۔"

نوکر اس کی میٹھی میٹھی ہمدردی کی باتیں سن کر خوش ہو جاتے اور سب کے سب اس سے بے حد پیار کرنے لگے۔

سردی کا موسم آیا۔ شوشو کے پاس گرم کپڑے نہیں تھے۔ وہ ایک دن مدرسے سے گھر آرہی تھی کہ راستے میں بارش آگئی اور بھیگنے سے ٹھنڈ لگی تیز بخار ہو گیا۔ پھوپھی نے ڈاکٹر کو بلایا اس نے دوا دی اور کہا، "اس بچی کو اس اندھیری کوٹھری میں نہ رکھا جائے اس کو تازہ اور صاف ہوا کی ضرورت ہے۔"

مجبوراً اس کی پھوپھی نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ شوشو یہ دیکھ کر

اور بھی خوش ہوئی اور پھوپھی سے کہنے لگی، "پھوپھی جان، دیکھا آپ نے اللہ میاں نے مجھے اس لیے بیمار کیا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلالیں۔ اب میں آپ کے پاس رہنے لگی۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ کیوں، ہے نا پھوپھی جان!"

پھوپھی کو اس کی بیماری میں اپنے پاس رہنے اور اس کی پیاری پیاری باتیں سننے سے اس کے ساتھ پیار ہو گیا۔

شوشو کو نوکروں نے بتایا تھا کہ اس کی پھوپھی رُپیہ خرچ کرنے سے گھبراتی ہے۔ یہ سوچ کر ایک دن اس نے پھوپھی سے کہا، "پھوپھی جان، یہ ڈاکٹر صاحب روزانہ کیوں آتے ہیں، بیکار اتنا رُپیہ آپ سے لے جاتے ہیں۔ اب تو میں آپ کے پاس ہوں اور اچھی ہو رہی ہوں۔ دواؤں کی بھی اب ضرورت نہیں۔ جلدی چلنے پھرنے لگوں گی۔ اب ڈاکٹر صاحب کو نہ بلائیں اور دوا بھی نہ منگوائیں۔ آپ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں۔ میں تو اس سے ہی اچھی ہو گئی۔ میرے آنے سے آپ کا ڈھیروں رُپیہ خرچ ہو رہا ہے۔"

اس کی پھوپھی یہ باتیں سن کر بے اختیار ہنس دی۔ اس نے کہا، "نہیں میری بچی، تم اس کی فکر نہ کرو۔ ابھی تمھیں دوا کی ضرورت ہے۔ تم اچھی ہو جاؤ تو میں تمھارے لیے گرم کپڑے بھی لاؤں گی۔"

شوشو مارے خوشی کے پاگل سی ہو گئی۔ اس نے زور زور سے خوشی میں تالیاں بجائیں اور "آہا ہا میری پھوپھی جان" کہتی ہوئی ان کے گلے سے لپٹ گئی۔ پھر کہنے لگی، "بھلا نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ بے کار اتنا رُپیہ خرچ کریں۔ آپ کے پاس اپنے پُرانے کپڑے ڈھیر سارے ہوں گے۔ بس ان ہی سے کاٹ چھانٹ کے مجھے بنوا دیجیے۔"

پھوپھی اس ننھی بچی کی یہ باتیں سن کر تعجب سے اسے تکنے لگی۔ اس نے سوچا، "کتنی سمجھ دار نیک اور صبر والی بچی ہے۔" شوشو چند دنوں بعد تن درست ہو گئی۔ اس کی پھوپھی نے بازار سے اس کے لیے بہت سے نئے گرم کپڑے خریدے۔ شوشو اب بہت آرام سے خوشی خوشی

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

دُنیا کا سب سے پہلا کیمیا دان

جابر بن حیّان

کوثر چاند پوری

آئیے آج آپ کو ایک مشہور کیمیا داں یعنی کیمسٹ سے ملائیں۔ ان کا نام جابر بن حیّان ہے۔ یورپ والے انھیں "جیبر" کہتے ہیں۔ جابر اصل میں عرب کے ایک قبیلے "یزد" کے ایک فرد تھے۔ یہ قبیلہ عرب کے جنوبی حصے میں آباد تھا۔ اس کے کچھ لوگ کوفے میں بھی بس گئے تھے۔ اسی شہر میں جابر کے باپ "حیان" دوا سازی کی دوکان کرتے تھے، یعنی وہ "عطار یا دوا فروش" تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب بنی امیہ کی سلطنت کمزور ہو چکی تھی اور تختِ خلافت پر قبضہ کرنے کے لیے بنو عباس کی جانب سے بڑی سرگرم کوششیں بلکہ سازشیں ہو رہی تھیں اور دوسری صدی ہجری شروع ہو چکی تھی۔ بنی امیہ نے کربلا کے ریگستان میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں پر جو ظلم

توڑے تھے اُن کی وجہ سے لوگوں میں عام بد دلی پیدا ہو گئی تھی اور حکومت میں انقلاب لانے کی یہ کوششیں اسی کا نتیجہ تھیں، یہ کوششیں پچاس برس کے زمانے میں کئی بار ہوئیں اور دب گئیں۔ بنی امیہ نے ہر مرتبہ تلوار کے زور سے انھیں دبا دیا، لیکن دوسری صدی کے شروع ہوتے ہی یہ آگ اتنے زور سے بھڑک اٹھی کہ اس کا بجھانا مشکل ہو گیا۔ خراسان جو ایران کا شمالی صوبہ تھا، اس انقلاب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس صوبے کے شہر طوس میں انقلابی جمع ہو کر آس پاس کے علاقوں میں اپنا کام کرتے تھے۔ جو پکڑ لیے جاتے تھے، انھیں بے دردی سے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ جو بچ رہتے وہ اپنی دھن میں لگے رہتے۔ اسی زمانے میں جابر کے باپ حیان بھی کوفے کی دوکان چھوڑ کر طوس آ گئے اور انقلابیوں کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ جابر ۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے تھوڑے ہی دن بعد حیان کو حکومت کے آدمیوں نے پکڑ لیا، چوں کہ یہ انقلابی جماعت کے بہت سرگرم رکن تھے، اس لیے ان کو موت کی سزا دے دی گئی۔ اب جابر اکیلے رہ گئے۔ ان کی اماں اپنے ننھے بچے کو لے کر عرب چلی گئیں اور اپنے قبیلے والوں کے ساتھ رہنے لگیں۔ جابر ننھیال میں پرورش پاتے رہے۔ انھوں نے قرآنِ پاک کی تعلیم ایک بہت بڑے استاد سے پائی، جن کا نام حربی الحمیاری تھا۔ ریاضی اور دوسرے علوم بھی ان ہی سے پڑھے۔ جب یہ جوان ہوئے یعنی چھبیس سال کی عمر ہوئی تو وہ انقلاب بھی کامیاب ہو گیا، جس کے لیے ان کے باپ حیان نے اپنی جان قربان کی تھی۔ تختِ خلافت بنو عباس کے قبضے میں آ گیا اور اس خاندان کا پہلا خلیفہ ابو العباس ۷۴۷ء میں تخت پر بیٹھ گیا۔ جابر اپنے قبیلے کو چھوڑ کر مدینے آ گئے۔ یہاں انھوں نے حضرت امام جعفر صادقؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس مذہبی تعلق ہی کا اثر تھا کہ جابر پر

ہمیشہ مذہب کا اثر رہا، حالاں کہ وہ سائنس سے تعلق رکھتے تھے اور اسی سلسلے میں تحقیقات کیا کرتے تھے۔ یہاں سے جابر دوبارہ اپنے آبائی وطن کوفہ چلے گئے۔ یہیں انھوں نے اپنی تحقیقات کے لیے ایک تجربہ گاہ بنائی۔ انھوں نے کیمیا کی تحقیقات میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل کی کہ انھیں دنیا کا سب سے پہلا کیمیا داں کہا جاتا ہے۔ ان کے اس مرتبے کو یورپ میں بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دو سو سال بعد کوفے کے اس حصّے کی کھدائی ہوئی، جو دروازے کے اندر تھا تو جابر کی تجربہ گاہ کے آثار دستیاب ہوئے اور چند کیمیائی آلات بھی ملے۔ جابر یونانی زبان سے بھی واقف تھے، انھوں نے براہ راست یونانی زبان کا علم حاصل کیا تھا۔ اسی قابلیت سے وہ یونانی علوم کو عربی میں ترجمہ کرنے کے لائق ہو سکے تھے۔ جابر کی دسترس صرف کیمیا ہی تک نہیں تھی، یہ ان کا خاص میدان ضرور تھا، پھر بھی انھوں نے علمِ ہندسہ اور ہیئت پر بھی کتابیں لکھیں۔ ایک رسالہ منطق اور ایک شاعری پر بھی اپنی یادگار چھوڑا۔ جس وقت ہارون الرشید تخت پر بیٹھا ہے، جابر بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی عمر اس وقت یعنی ۷۸۶ء میں باسٹھ ۶۲ برس کی ہو چکی تھی۔ جعفر برمکی نے جو ہارون کا دوسرا وزیر تھا، جابر کی شہرت سن کر ان کو بغداد بلایا۔ چناں چہ جابر بغداد آئے اور جعفر برمکی کے نوکر ہو گئے۔ چند بار انھیں ہارون کے دربار میں جانے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب جو کیمیا پر تھی، ہارون کے نام منسوب کی۔ ۸۰۳ء میں جعفر برمکی کے قتل ہو جانے پر جابر بغداد میں نہ ٹھہر سکے اور کوفہ واپس چلے گئے۔ جابر کی عمر بہت لمبی ہوئی۔ ۸۱۳ء میں مامون الرشید خلیفہ ہو کر تخت پر بیٹھا تو جابر زندہ موجود تھے۔ ان کی عمر اس وقت نوّے ۹۰ برس کی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ مامون کے زمانے میں بھی وہ دربار میں گئے تھے اور انھیں خلیفہ نے خلعت عنایت کیا تھا۔

۸۱۷ء میں جابر کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثے کے وقت ان کی عمر بچانوے سال کی تھی، جابر عمر بھر کم قیمت دھاتوں کو قیمتی دھاتوں میں بدلنے کی دُھن میں لگے رہے۔ وہ دھاتوں کو حل کرنے، چھاننے، کشید کرنے اور ان کے جوہر اڑانے کے تجربے کرتے رہے۔ اسی وجہ سے ان کو پرانے زمانے کے بہت بڑے سائنس دانوں میں گنا جاتا ہے۔ جابر فن کیمیا میں تجربے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو شخص اپنے علم کو تجربے کی مدد سے نہیں بڑھاتا وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ کیمیا داں کی بڑائی اس میں نہیں کہ وہ بہت پڑھا لکھا ہے، بلکہ اس میں ہے کہ اس کا تجربہ کتنا ہے اور اپنے تجربات سے اس نے کتنی چیزیں ثابت کی ہیں۔ جابر کا خیال تھا کہ تمام دھاتیں گندھک اور پارے کی ترکیب سے بنتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں خالص صورت میں جب کیمیائی تناسب سے ملتی ہیں تو سونا تیار ہوتا ہے، مگر ان کی کمی بیشی اور دوسری کثافتوں کے مل جانے کی صورت میں دوسری دھاتیں، یعنی چاندی، سیسہ، تانبہ، لوہا وغیرہ بنتی ہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چوں کہ سونے اور دوسری دھاتوں کی ترکیب میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، اس لیے گھٹیا دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر لینا ممکن ہے۔ جابر کا یہ نظریہ اٹھارھویں صدی تک برقرار رہا۔ تکلیس کا عمل یعنی دھات کا کشتہ بنانا، درحقیقت دھات کو گرمی پہنچا کر اس کو آکسائڈ میں تبدیل کرنا ہے۔ جابر اس کام سے واقف تھے۔ انھوں نے دھاتوں کا کشتہ بنانے پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جابر فولاد بنانے، چمڑہ رنگنے، دھاتوں کو صاف کرنے اور موم جامہ وغیرہ بنانے کے راز سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں ان کے تیار کرنے کی ترکیبیں لکھی ہیں۔ وہ لوہے پر وارنش کرنے کا کام بھی جانتے تھے اور سفید بالوں کو سیاہ کرنے کی غرض سے خضاب بھی تیار کر لیتے تھے، بہرحال جابر کیمیا کے کام میں بہت ماہر تھے۔ جن کاموں کی انجام دہی کے لیے

موجودہ عہد میں بھی بہت کافی فنی صلاحیت اور تجربے کی ضرورت ہے، ان کو جابر اب سے بہت پہلے نہایت عمدگی سے کر لیا کرتے تھے۔ ان کی اسی قابلیت کے باعث انھیں کیمیا کا بہت بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے۔ جس آلے سے عرق کھینچنے کا کام کیا جاتا ہے اور جسے "قرع انبیق" کہتے ہیں، اس کو جابر ہی نے ایجاد کیا ہے۔ اس سے ست بنانے اور جوہر حاصل کرنے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ در اصل اس آلے کے دو حصے ہوتے ہیں، جو حصہ صراحی کی شکل کا ہوتا ہے، جس کی گردن چوڑی اور چھوٹی ہوتی ہے اسے "قرع" کہتے ہیں اور جو حصہ بھبکے کی شکل کا ہوتا ہے، اس کو "انبیق" کہتے ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک لمبی نلکی لگائی جاتی تھی۔ دوسرا حصہ پہلے حصے کے منھ پر خوب پھنس جاتا تھا۔ دونوں کے جوڑ پر مٹی لگا دی جاتی تھی، پھر بہت احتیاط سے پکایا جاتا تھا۔ اس کی گرمی سے اندر بھری ہوئی دواؤں میں سے بھاپ بن کر انبیق میں لگی ہوئی لمبی نلکی سے باہر نکلنا شروع ہو جاتی تھی۔ نلکی میں پہلے ہی سے بوتل لگا دی جاتی تھی، جس کا بیرونی حصہ پانی میں پڑا رہتا تھا۔ پانی کی ٹھنڈک سے بخارات پانی (سیال) کی شکل میں ٹپکنے لگتے تھے۔ جابر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شورے کا تیزاب دریافت کیا۔ اس کو انھوں نے قرع انبیق ہی کے ذریعے تیار کیا تھا۔ جابر نے شورے کے تیزاب کو تین چیزوں یعنی پھٹکری، ہیرا کسیس اور قلمی شورے کی ترکیب سے تیار کیا تھا۔ جابر نے شورے کے تیزاب کی تیاری کا ذکر جس انداز میں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کا کتنا شوق رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

قرع انبیق میں پھٹکری اور بقیہ دونوں چیزیں ڈال کر اس کا منھ انبیق سے بند کر دیا گیا، پھر اسے کوئلوں کی آگ پر چڑھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد دیکھا گیا کہ آگ کی گرمی سے انبیق کی نلکی میں سے بھورے رنگ کے بخارات نکل رہے ہیں اور یہ بخارات تانبے کے بیرونی برتن میں داخل ہو کر سیال صورت

میں آتے جا رہے ہیں۔ یہ سیال اتنا تیز تھا کہ اس نے تانبے کے برتن میں سوراخ ڈال دیے اور قرع انبیق کو بھی خراب کر دیا۔ جب میں نے اس سیال میں انگلی ڈالی تو میری انگلی جل گئی، جس نے کئی روز تک تکلیف دی۔ میں نے اس سیال کا نام تیزاب (تیز آب) رکھ دیا۔ چوں کہ اس میں شورے کا جز غالب تھا اسی کی تیزی نمایاں تھی، اس لیے اس کو شورے کا تیزاب کہا گیا۔ سونا اور شیشہ ہی ایسی دو چیزیں تھیں، جن پر شورے کے اس تیزاب کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ ورنہ اس سے چاندی کی کٹوری میں بھی سوراخ ہو جاتے تھے۔

جابر کے تجربات جاری رہے۔ انھوں نے پھٹکری اور ہراکسس سے ایک گاڑھا سا شربت بھی بنایا، جس کو ہیراکسیس کا تیل کہنا چاہیے۔ اس تیل سے کاغذ گل جاتا تھا۔ جابر نے پھٹکری، ہراکسیس اور قلمی شورے میں نوشادر کا اضافہ کر کے اسی ترکیب سے ایک اور تیزاب حاصل کیا، جو شورے کے تیزاب سے بھی تیز تھا۔ اس میں اور دھاتوں کے علاوہ سونا بھی گل جاتا تھا۔ سونے کے اس محلول کا نام جابر نے ماء الملوک یعنی بادشاہوں کا پانی رکھا۔ نئی تحقیقات کی رو سے یہ تیزاب شورے اور نمک کے تیزاب کا مرکب ہے، مگر جابر اس بات کو سمجھ نہ سکے تھے۔ وہ اسے ایک ہی تیزاب خیال کرتے تھے۔ جابر کو یتیمی اور خانہ بدوشی نے زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ انھوں نے فن کیمیا میں جو نام پیدا کیا اس کی بنیاد صرف ان کی محنت، قابلیت اور اعلا دماغی و ذہنی صلاحیت پر تھی۔ جابر کی مثال آپ کے لیے ایک ایسا راستہ کھولتی ہے، جس پر چل کر آپ بھی شہرت، قابلیت اور بڑائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سائنس کا زمانہ ہے، اگر آپ نے سائنس میں دل چسپی لی اور محنت سے پڑھا تو بہت ممکن ہے کہ آپ موجودہ دور کے سب سے بڑے سائنس داں بن جائیں!

دنیا کا سب سے پرانا جہاز

مسعود احمد برکاتی

مشہور انگریز امیر البحر لارڈ نیلسن کا جہاز وکٹری "دنیا کا سب سے پرانا جہاز مانا جاتا تھا۔ جس کو ایک سو ستر سال سے انگریزوں نے ایک قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اگست ۱۹۶۱ء میں سوئیڈن کے دار السلطنت اسٹاک ہوم میں ۳۳۰ سال پہلے ڈوبا ہوا ایک جنگی جہاز "واسا" سمندر کی تہہ سے نکالا گیا ہے۔ اسٹاک ہوم کی بندرگاہ میں ایک پختہ گودی میں "واسا" کو محفوظ کر کے صدیوں سے پانی میں پڑے رہنے سے جو کیچڑ اور گاد بھری

ہوئی تھی، اس سے اس کو صاف کیا
گیا ہے۔ صفائی کے دوران میں ڈیڑھ
لاکھ آدمیوں نے اس عجیب جنگی جہاز کو
دیکھا۔ تجویز یہ ہے کہ اس جہاز کے لیے
ایک خاص قسم کی عمارت بنائی جائے گی،
تاکہ وہ ایک مستقل عجائب گھر بن جائے۔
اس کی صفائی کے علاوہ اس کی ضروری
مرمت بھی کی جا رہی ہے۔

یہ جنگی جہاز سویڈن کے بادشاہ
گستے وس اڈالفس دوم نے ۱۶۲۷ء
میں بنوایا تھا۔ اس کا نام اس شاہی
خاندان کے بانی گستے وس واسا کے نام
پر "واسا" رکھا گیا۔ بادشاہ اڈالفس دوم
۱۶۱۱ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس زمانے میں
سویڈن کی پولینڈ، ڈنمارک اور روس
تینوں ملکوں سے جنگ جاری تھی۔ بادشاہ
اڈالفس نے ڈنمارک اور روس سے صلح
کرلی اور کچھ مدت کے بعد پولینڈ سے بھی
جنگ بند ہوگئی۔ اب بادشاہ اور رعایا
کو موقع ملا کہ علم و فن کو ترقی دیں اور
تجارتی تعلقات بڑھائیں۔ اسی زمانے
میں سویڈن کی مشہور یونی ورسٹی "اپسلا"
شہر میں قائم کی گئی۔ اس زمانے میں
یورپ "تیس سالہ جنگ" میں مبتلا تھا، جو
دراصل ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک
شدید مذہبی جنگوں کا ایک سلسلہ تھا۔
جرمنی کے رومن کیتھولک بادشاہ فرڈیننڈ
نے ناروے اور سویڈن کے پروٹسٹنٹ
ملکوں پر حملہ کرنے کے لیے جنگی جہازوں
کا ایک بیڑا تیار کیا۔ اپنے ملک اور
مذہب کی حفاظت کرنے کے لیے سویڈن
کے بادشاہ گستے وس اڈالفس نے ۱۶۲۵ء
میں چار بڑے جنگی جہاز تیار کرنے کا
حکم دیا، جن میں یہ جہاز "واسا" بھی
تھا۔ یہ جہاز غالباً ۱۶۲۷ء میں تیار
ہوگیا تھا۔ بادشاہ کی تجویز یہ تھی کہ اپنی
سویڈش فوج لے کر جرمنی میں دور تک
مقابلہ کرتا چلا جائے اور واپسی ان جنگی
جہازوں کے ذریعے ہو۔

۱۶۲۸ء اگست کی دس تاریخ
اتوار کے دن دوپہر کو یہ شان دار جہاز
اسٹاک ہوم کے جزائر میں اپنے پہلے سفر
پر روانہ ہوا۔ ابتدا میں ہوا ہلکی تھی، لیکن
بعد میں تیز آندھی چلنے لگی، جہاز ڈگمگانے
لگا اور ایک طرف کو جھک گیا۔ جہاز
کے توپ چی نے توازن برابر کرنے کے

لیے دوسری سمت میں توپوں کو آگے بڑھایا، لیکن یہ کوششیں بے سود ہوئیں۔ جہاز جس سمت جھکا ہوا تھا. اُدھر توپوں کے سوراخوں میں سے پانی جہاز میں داخل ہونے لگا۔ آخر واسا جہاز ڈوب گیا۔ اس جہاز میں غالباً ۱۳۳ ملاح اور ۳۰۰ سپاہی تھے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کتنے آدمی ڈوب مرے۔ جہاز کا کپتان سورن ہین سن زندہ بچ نکلا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ اس نے حلفیہ بیان دیا کہ وہ شراب پیے ہوئے نہیں تھا اور اس کی بھی تصدیق کی کہ تمام توپیں مضبوطی سے باندھی گئی تھیں۔ تحقیقاتی عدالت جہاز کے ڈوبنے کی اصلی وجہ معلوم نہ کر سکی۔ جہاز واسا میں ۶۴ توپیں تھیں، جن میں ۴۸ چھے پنچ کی، دُور مار توپیں تھیں۔ توپیں پیتل کی تھیں، جن میں کئی ایک کا وزن تین ہزار پونڈ تھا۔ تمام توپوں کے وزن کا اندازہ اسّی ٹن کیا گیا ہے۔

سترھویں صدی میں اس جہاز کو نکالنے کی تین کوششیں کی گئیں۔ ۱۶۶۴ء میں آخری بار یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دیا گیا کہ اس ڈوبے ہوئے جہاز سے ترپّن توپیں باہر نکالی گئیں اور دوسرے ملکوں کو فروخت کر دی گئیں۔ یہ جہاز سمندر کی تہہ میں پندرہ فیٹ کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ اس آخری کوشش کے بعد لوگ اس جہاز کو بھول گئے۔ لوہے کی کیلیں زنگ آلود ہو گئیں اور اس کی بہت سی آرائشی چیزیں ٹوٹ ٹوٹ کر کیچڑ میں گر گئیں۔ دوسرے جہاز اس کے

اوپر لنگر انداز ہوتے تھے۔ چناں چہ جب اس جہاز کو باہر نکالا گیا ہے تو اس میں کئی پھنسے ہوئے لنگر ملے۔

۱۹۲۰ء میں کسی طرح اس جہاز کا پھر سے پتہ چلا۔ غوطہ خوروں نے دو شاندار توپیں باہر نکالیں۔ ۱۹۵۶ء میں ۴۳ سالہ آندرس فران زن نامی بحری آثارِ قدیمہ کے ماہر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ 'واسا' جہاز اس مقام پر صحیح سالم ہوگا، کیوں کہ بحیرۂ بالٹک کے اس تازہ پانی میں جہاز کی لکڑی کو کھانے والے کیڑے زندہ نہیں رہ سکتے۔ جب اس نے جہاز کے مقام کا پتہ چلالیا، غوطہ خوروں نے غوطہ لگا لگا کر اس کے اندر سے سترھویں صدی کی بہت سی نادر چیزیں نکال لیں۔ ان چیزوں میں شان دار لکڑی کے پتلے جادوگری کے آلات، مٹی کے برتن، کھانا پکانے کے برتن، ٹین کی رکابیاں، مکھن کا ایک پیپہ، لکڑی کا ایک بڑا پیالہ، ایک پچرسی جام، ایک منقش رکابی، ایک ملاح کی کھوپڑی، ایک چمڑے کا بوٹ، چار اور پیتل توپیں تھیں۔ اس جہاز میں بڑا خزانہ بھی ہوگا، مگر وہ نہیں ملا۔ البتہ چند سکّے ضرور ملے، جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ ملّاحوں کے ہوں گے، لیکن اس جہاز کے ڈوبنے کا حال کسی طرح نہ معلوم ہوسکا۔ خیال ہے کہ واسا جہاز بہت بڑا بنایا گیا۔ اس کی لمبائی ۱۵۰ فیٹ تھی اور چوڑائی ۴۲ فیٹ اور اونچائی ۵۴ فیٹ تھی۔ اس کا درمیانی مستول ڈیڑھ سو فیٹ اونچا تھا۔ جہاز کی اس جسامت کو بادشاہ نے خود پسند کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ چھوٹے جہازوں کا بنانا درختوں کو ضائع کرنا ہے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اس جہاز کا ڈیزائن غلط تھا۔ اس کی تہہ بہت گہری اور نکیلی ہوگئی تھی، اس لیے توپیں چڑھانے کے بعد یہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس جہاز کو باہر کی طرف سے لکڑی کی بہت سی چیزوں سے سجایا گیا تھا۔ سامنے شیر کا بہت بڑا سر لگایا گیا تھا۔ توپ کے سوراخوں پر شیر کے چہرے بنے ہوئے تھے، تاکہ جب ان پر سے ڈھکنا ہٹایا جائے تو دشمن مرعوب ہوجائے۔ جہاز پر سرخ اور سنہرے روغن کے آثار بھی ملتے ہیں۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جن عرشوں پر توپیں رکھی ہوئی تھیں، ان کو خون کا سا سرخ رنگا گیا تھا، تاکہ سپاہی دشمن کا خون بہتا دیکھ کر گھبرا نہ جائے۔

ماہرین اس جہاز کو اصلی حالت میں لانے کی ہر طرح کی کوشش کر رہے ہیں۔ غوطہ خور جن جن چیزوں کو نکال لاتے ہیں، انھیں نہایت حفاظت سے گوداموں میں رکھا گیا ہے، تاکہ انھیں اپنے اپنے مقام پر رکھا جائے۔ یہ منصوبہ، جس کو فران زن نے بنایا ہے، "واسا بورڈ" کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ اس بورڈ کا صدر شہزادہ برٹیل ہے۔ اس منصوبے پر بیس لاکھ ڈالر خرچ ہوں گے۔ بورڈ کے ممبر شہر اِسٹاک ہوم کے نمائندے، دفترِ قومی آثار کے عہدیدار، نیوی کے افسر، قومی بحری عجائب خانے کے ماہر، سویڈش یونی ورسٹیوں کے پروفیسر اور وزارتِ خارجہ کے عہدے دار ہیں۔

واسا جہاز بڑا بدنصیب جہاز تھا، لیکن اگر وہ اپنی بدقسمتی سے ڈوب نہ جاتا تو سترھویں صدی کے جنگی جہازوں کے ساتھ اپنا کام ختم کرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا۔

بچوں کی دعا

وحیدہ نسیم

مولا یہ التجا ہے
تجھ سے مری دعا ہے

دل کھیل کو نہ ترسے — کل بند ہوں مدرسے
مل جائے اک اکنی — منگوائیں اس کی برفی
آٹا ملے کہیں سے — پیڑے بنائیں اس کے
ہم پوریاں پکائیں — برفی سے اس کو کھائیں
ملتی رہے مٹھائی — اپنی ہو یا پرائی

مولا یہ التجا ہے
تجھ سے مری دعا ہے

دل کھیل کو نہ ترسے — کل بند ہوں مدرسے
امی کہیں گئی ہوں — آپا بھی سو رہی ہوں
کوئی نہ ہم کو روکے — کوئی نہ ہم کو ٹوکے
مٹی کا اک گھروندا — دالان میں بنائیں
سگرٹ کی ڈبیوں سے — اس گھر کو ہم سجائیں
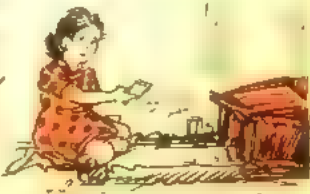
مولا یہ التجا ہے
تجھ سے مری دعا ہے
دل کھیل کو نہ ترسے کل بند ہوں مدرسے
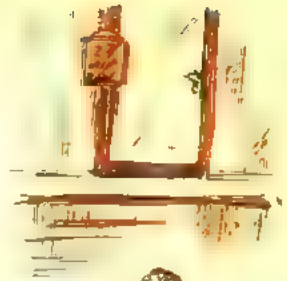
مولا یہ التجا ہے
تجھ سے مری دعا ہے
دل کھیل کو نہ ترسے کل بند ہوں مدرسے
ابّا گئے ہوں باہر امّی بھی ہوں نہ گھر پر
ہے آرزو یہ دل کی سائیکل ملے کسی کی
بھیا کا کیمرا لوں چپکے سے گھر سے نکلوں
ہاکی کا میچ دیکھوں کرکٹ کا میچ کھیلوں

مولا یہ التجا ہے
تجھ سے مری دعا ہے
دل کھیل کو نہ ترسے کل بند ہوں مدرسے
لٹو گھماؤں دن بھر سیٹی بجاؤں دن بھر
کچھ دوستوں کو لے کر جاؤں میں ہاکس بے پر
پانی میں مَیں نہاؤں غوطے وہاں لگاؤں
اِک گیند ساتھ رکھوں ریتی میں جا کے کھیلوں

مولا یہ التجا ہے
تجھ سے مری دعا ہے

ٹیری کے — ظفر اقبال جنّہ

ایسی مچھلیاں
جو
سولہ فیٹ اونچی
چھلانگ لگا سکتی ہیں

ریفری نے سیٹی بجاتے ہوئے کہا: "باسکٹ بال کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔ ایک بڑی سی مچھلی گیند لیے ہوئے تالاب میں آئی۔ اس مچھلی کا نام الگائی تھا۔ دوسری مچھلی نے، جس کا نام اسپلیش تھا، اس سے گیند چھیننے کی کوشش کی۔ الگائی گیند کو پانی کی تہہ میں لے گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اسپلیش بھی گئی۔ پھر وہ فوراً ہی پانی کی سطح پر اُبھر آئی اور اس نے گیند کو اچھال کر اس کے صحیح مقام، یعنی ٹوکری میں ڈال دیا اور اس طرح بازی جیت لی۔

سمندر کی یہ بھانڈ مچھلیاں سمندر کی دوسری تمام مخلوقات سے زیادہ سمجھ دار ہوتی ہیں۔ جو نت نئے کرتب دکھاتی ہیں۔ فلوریڈا کے شہر میرین لینڈ کے میرین اسٹوڈیو میں ان کے کمال دیکھنے کے لیے روزانہ ہزاروں سیاح آتے ہیں۔ فلوریڈا میں سینٹ آگسٹین کے

میرین اسٹوڈیو کی تمام سدھائی ہوئی مچھلیوں میں الگائی ایک بہترین کھلاڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ جب اچھل کر عمودی طور پر سولہ فٹ کی بلندی تک جا سکتی ہے

مقام پر سمندر کے ایک چھوٹے سے خشک حصے پر یہ مچھلیاں باسکٹ بال کھیلتی ہیں۔ اس کھیل میں دو مچھلیاں حصہ لیتی ہیں، جو کھیل میں عموماً عام سائز کا گیند اور گول ٹوکری استعمال کرتی ہیں۔ الگائی مچھلی نے سب سے پہلے فٹ بال ٹیم بھی بنائی تھی۔ اس ٹیم کی سب سے اچھی کھلاڑی فٹ بال کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے جس کو اس کا سکھانے والا پھینکتا ہے۔ ایک اڑن مچھلی پانی کی سطح سے چھلانگ لگا کر کئی فیٹ اوپر اٹھ جاتی ہے اور ایک گوشت کے لوتھڑے کو اپنے منھ میں دبوچ لیتی ہے۔ الگائی کی اڑان بھی اچھی ہے۔ وہ پانی کی سطح سے تقریباً سولہ فیٹ تک جست لگا سکتی ہے۔ پانی کی ان مچھلیوں کا دوسرا کمال یہ بھی ہے کہ اگر ان کا سکھانے والا گوشت کا لوتھڑا فضا میں بیس فیٹ تک پھینکے تو اس کو وہیں اپنے منھ میں دبوچ لیں گی۔

میرین اسٹوڈیو ایک سب سے زیادہ مشہور مچھلی تھی، جس کا نام فلپی تھا۔ وہ اس تختے کو بآسانی چھو لیتی تھی، جہاں تماشائی کھڑے ہوتے تھے۔ اس مقصد کے لیے فلپی کو ایک خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا تھا۔ اس کا سکھانے والا فلپی پر یہ لباس ڈالتا اور پھر مختلف احکامات دیتا تھا تو فلپی اوپر اٹھتی اور تختے کے ساتھ ساتھ تماشائیوں کے پیروں کو بھی چھو آتی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں فلپی کا انتقال ہو گیا اور اسپلیش اور الگائی میرین اسٹوڈیو کی روح رواں بن گئیں۔

ایک مچھلی سدھانے والا گیند پھینک رہا ہے، جسے الگائی پکڑ رہی ہے

اسپلیش اور الگائی بربروزا اسکول

جاتی ہیں، جہاں وہ اپنے کمالات کی بہتر سے بہتر مشق کرتی ہیں۔ الگائی کے اُستاد کو اس سے بڑا پیار ہے۔ وہ اس کو ہر روز ایک سیب دیتا ہے اور وہ شکریے کے اظہار کے لیے اپنے اُستاد سے ہاتھ ملاتی ہے۔ دراصل الگائی کو یہ سب باتیں سکھا دی گئی ہیں۔ جب تماشائی الگائی کے کمالات دیکھتے ہیں تو اس کو بڑا پسند کرتے ہیں۔

اسپلیش اپنے تماشائیوں کو دیکھ کر ایک خاص آواز میں سیٹی سی بجاتی ہے اور یہ اس کا گانا ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنے سر پر لگی ہوئی سانس کی نالی کو کام میں لاتی ہے، جو بیرونی ہوا کے دباؤ سے اثر انداز ہوتی ہے اور وہ میرین سٹوڈیو کے ایک دوسرے جانور کو پانی کی لہروں پر کھینچتی ہے۔ اسپلیش بھی ایک پہیے کی مدد سے فضا میں اُچھلتی ہے۔ یہ چالاک سمندری مچھلی اکثر کتوں سے زیادہ کرتب جانتی ہے۔ اگر اس کو پانی کی سطح پر مرنے کا حکم دیا جائے تو یہ اس حکم کی فوراً تعمیل کرتی ہے۔ اگر کہیں آگ لگا دی جائے تو اسپلیش اپنی تھوتھنی میں پانی بھر کر اس آگ پر ڈالے گی اور اس وقت تک پانی ڈالتی رہے گی، جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔

دوسری دو سمندری مچھلیاں بھی ہیں، جو نئے نئے کرتب سیکھ رہی ہیں۔ وہ ابھی سیکھ رہی ہیں اور سیکھنے کے لیے دونوں ہر روز اسکول جاتی ہیں۔ جو ان مچھلیوں کو کرتب سکھانے کے لیے کھولا گیا ہے۔

البتہ الگائی اور اسپلیش بڑی باکمال اور پیاری سمندری مچھلیاں ہیں، جو اپنے کرتبوں سے بچوں اور ان کے والدین کو خوش رکھتی ہیں۔

سیٹی بجا کر الگائی کو انعام دیا جا رہا ہے

کسی زمانے میں بغداد کے شہر میں ایک تاجر رہتا تھا، جس کا کار بار بہت اچھا تھا اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے زندگی گزار رہا تھا۔ اس طرح رہتے رہتے جب اس کے پاس بہت دولت ہو گئی تو اس نے اپنے کار بار میں محنت کرنا چھوڑ دی۔ جب کوئی اس سے کہتا کہ تمھارا کار بار محنت کے بغیر نہ چلے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کاہلی اور سستی سے تمھاری تجارت میں نقصان ہونے لگے اور تمھیں آرام چین کے بجائے تکلیف ہو۔ بگڑا ہوا کار بار سنبھلنا مشکل ہے۔ توجہ اور محنت سے اس کو بڑھانے کی کوشش کرو، تو وہ کہہ دیتا کہ سب باتیں تقدیر سے ہوتی ہیں۔ میری تقدیر میں آرام ہے، میں سدا چین سے رہوں گا۔ گر تقدیر بگڑ جائے تو کار بار بھی خراب ہو جائے گا۔ محنت اور تدبیر سے کیا ہوتا ہے!" عقل مند لوگوں نے انھیں سمجھایا کہ تقدیر اور تدبیر دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ انسان تدبیر اور محنت نہ کرے اور تقدیر کے بھروسے پر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ تدبیر اور کوشش انسان کو بناتی ہے۔

آخر کافی دن گزرتے گئے۔ اس تاجر کی سستی بھی بڑھتی گئی۔ اس نے اپنی تجارت کو ترقی دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ صرف تقدیر کے سہارے پر بیٹھا کھاتا پیتا اور چین کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

تجارت میں گھاٹا ہونے لگا۔ جن لوگوں نے محنت اور کوشش سے کام کیا ان کا کاروبار خوب ترقی پر تھا۔ اس شخص کی حالت روز بروز بگڑتی گئی اور ایک زمانہ آیا کہ یہ تاجر روٹیوں کو بھی محتاج ہوگیا۔ ساری دولت بیٹھے بیٹھے ختم ہوگئی۔ بیوی بچوں کو فاقے ہونے لگے۔

اب اس تاجر کی آنکھیں کھلیں۔ وہ رات دن اس فکر میں رہنے لگا کہ اپنی اس بگڑی ہوئی حالت کو کیسے سنبھالے۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ اس کے سامنے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے نوجوان، اٹھ تیری تقدیر قاہرہ میں چمکے گی۔ جا اور تقدیر بنا اور چین آرام کی زندگی بسر کر۔

اس شخص کی آنکھ کھلی تو خوش ہوکر اٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ واقعی تقدیر ہی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ اس خواب کی تعبیر ضرور سچی ہوگی اور قاہرہ میں مجھے دولت اور فراغت ملے گی۔ وہ جلدی جلدی اپنا سامان درست کرکے قاہرہ کے لیے روانہ ہوگیا اور بیوی بچوں کو تسلی دے گیا کہ تم سب کو جلدی وہاں بلانے کا انتظام کروں گا۔

وہ شخص چلتے چلتے قاہرہ پہنچا اور شہر میں داخل ہوا تو شام ہوگئی تھی۔ وہ سیدھا ایک مسجد میں چلا گیا۔ اور رات کو وہیں ایک طرف سوگیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس مسجد کے برابر ایک امیر آدمی کا مکان تھا۔ اس

رات کو امیر آدمی کے گھر چور آ گیا۔ چور سامان لے کر بھاگنے لگا تو گھر والوں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سامان چھوڑ کر بھاگا اور مسجد کی دیوار کود کر کسی طرف چلا گیا۔ شور غل سُن کر پولیس کے آدمی آ گئے۔ امیر آدمی نے انھیں بتایا کہ چور مسجد کی طرف سے بھاگا ہے۔ پولیس والوں نے مسجد میں جا کر چور کی تلاش شروع کی اور ایک طرف اس تاجر کو پڑا دیکھ کر پکڑ لیا۔ اس نے بہت کہا کہ میں بغداد سے آیا ہوں۔ ایک غریب مسافر ہوں، چور نہیں ہوں، مگر پولیس والوں نے اس کی ایک نہ سنی اور مارتے پیٹتے تھانے لے گئے۔ اس سے پھر پوچھ گچھ کرنے لگے کہ تو نے اس امیر آدمی کے گھر میں گھس کر چوری کی۔ جب اس شخص نے کسی طرح نہ مانا اور اپنی بے گناہی جتاتا رہا تو قاضی کے سامنے لے جا کر پیش کر دیا۔

قاضی صاحب نے اس سے دریافت کیا کہ "کیا تم نے چوری کا ارادہ یا چوری کی تھی؟" اس کے جواب میں تاجر بغدادی نے قاضی کو اپنا سارا قصہ سنایا اور خواب کا حال بتا کر کہا کہ میں یہاں اپنی تقدیر تلاش کرنے آیا تھا۔ قاضی نے کہا، "تم بڑے نادان ہو۔ بھلا خواب کی باتوں پر بھی کوئی اعتبار کرتا ہے اور تقدیر اس طرح بھی بنا کرتی ہے جب تک کوئی تدبیر اور کوشش نہ ہو صرف تقدیر کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر قاضی نے اس شخص کو اپنا قصہ سنایا کہ میں نے بھی قاہرہ میں رہتے رہتے ایک مرتبہ خواب میں اسی طرح ایک بزرگ کو دیکھا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ "تمھاری تقدیر بغداد میں چمک سکتی ہے۔ وہاں جاؤ اور ایک باغیچے کے فوارے کے نیچے کھود کر خزانہ نکال لو۔ دولت مند بن جاؤ گے"، لیکن میں نے اس خواب پر اعتبار نہیں کیا اور اپنی موجودہ چین آرام کی زندگی کو چھوڑ کر تقدیر اور خواب کے دھوکے میں مارا مارا پھرنا پسند نہیں کیا۔"

اس کے بعد قاضی کو تاجر نوجوان کی باتوں سے یقین ہو گیا کہ یہ شریف آدمی پریشان حال اور غریب الوطن ہے چور نہیں ہے۔ اس لیے قاضی نے اسے رہا کر دیا اور اپنے پاس سے چند دینار دے کر کہا کہ تم اپنے وطن واپس جاؤ اور کوشش اور محنت سے کوئی کام کر کے اپنی تقدیر خود بناؤ۔

وہ تاجر بھی سوچنے لگا کہ واقعی خواب کا اعتبار کر کے میں نے اُلٹا اپنے آپ کو

مصیبت میں پھنسا لیا۔ خیریت گزری کہ قاضی کو میری باتوں پر اعتبار آگیا، ورنہ اس خواب نے تو مجھے قید خانے میں ڈال دیا ہوتا۔ چناں چہ وہ بے چارا قاہرہ سے روانہ ہو کر سیدھا اپنے وطن بغداد پہنچا اور جو دینار قاضی نے اس کو دیے تھے انھیں کھانے کے سامان کے علاوہ تھوڑے بہت کاروبار میں لگا کر محنت سے کام کرنے لگا۔ وہ کسی کام سے اپنے مکان سے نکل کر جا رہا تھا کہ راستے میں مکان کے سامنے ہی اسے وہ باغیچہ نظر آیا جس کا حال قاضی نے اپنے خواب کے ذکر میں بیان کیا تھا۔ وہ اس باغ کو روزانہ دیکھتا تھا، مگر کبھی اس طرف خیال نہ آتا۔ اب قاضی کے خواب کے یاد آنے سے وہ اس باغیچے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے وہ فوارہ بھی دیکھا جس کے نیچے خزانے کا ذکر سنا تھا۔ اس وقت تو وہ اپنے کام پر چلا گیا۔ رات گئے وہ اس باغیچے میں پھاوڑا لے کر پہنچا اور فوارے کو کھودنے لگا۔ کھودتے کھودتے جب غار بن گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں زمین کی تہ میں ایک صندوق رکھا ہے۔ اس نے جلدی جلدی اس صندوق کو باہر نکالا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، جب اس صندوق میں سونے کی اشرفیاں اور جواہرات بھرے ہوئے دیکھے، وہ صندوق اٹھا کر گھر لے آیا اور بیوی کو دکھایا۔ پھر دونوں مشورہ کر کے وہ صندوق خلیفہ کے دربار میں لے گئے، اور سارا حال بیان کیا۔ خلیفہ نے یہ حال سن کر کہا کہ "خدا نے تیری محنت کا پھل دیا ہے، ہم اسے تیری تقدیر اور تدبیر کا انعام سمجھتے ہیں" تاجر نوجوان خوشی خوشی گھر آگیا اور اطمینان کے ساتھ اپنے کاروبار کو ترقی دینے میں مصروف ہو گیا۔

★

دنیا میں سب سے پہلے جنھوں نے کاغذ بنایا وہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد اب بھی اسی طرح کاغذ بناتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہیں، بلکہ کیڑے ہیں، جن کو بھڑ کہتے ہیں۔ ان ہی کیڑوں کو اپنا گھر بناتے ہوئے ایک مرتبہ ایک چینی بزرگ نے دیکھا اور پھر کاغذ بنانے کا خیال ان کے دماغ میں آیا۔ بھڑ کا گھر جو وہ بناتی ہے، کاغذ کا ہوتا ہے۔ یہ کیڑا اپنے منھ میں پتے اور درختوں کی چھال لے کر اس کو چباتا ہے اور جب وہ لیئی جیسی ہوجاتی ہے تو اسی سے اپنے گھر کی دیواریں بناتا ہے اور وہ کاغذ ہوتا ہے۔

چینیوں نے حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے کاغذ بنایا تھا۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مصریوں نے لکھنے کے لیے ایک قسم کی کاغذ نما چیز پیپرس پودے سے بنائی۔ یہ پودا دریائے نیل کے کنارے پیدا ہوتا ہے۔ پیپرس کے باریک ورق ایک دوسرے پر اس طرح رکھے جاتے تھے

کہ وہ آپس میں مل کر ایک معلوم ہوں، پھر اُن کو پانی میں گیلا کرلیا جاتا تھا۔ اس کا پانی نکال کر اس کو دبا دیا جاتا تھا اور جو حصے ذرا اٹھے ہوئے ہوتے تھے ان کو ہاتھی دانت یا کوڑی سے گھس کر چکنا کرلیا جاتا تھا۔ یہ کاغذ سفید یا ہاتھی دانت کے رنگ کا سا ہوتا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھورا ہو جاتا تھا اور سختی آکر ٹوٹ جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسا ہم عجائب گھروں میں پیپرس دیکھتے ہیں۔

پیپرس عام خط وکتابت اور دستاویزوں کے لیے مصر سے روم اور یونان بھیجا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب پیپرس کی فصل تباہ ہوگئی تو سلطنت روما میں طوفان برپا ہوگیا اور عام کاروبار میں بڑی تکلیف ہوئی۔

آخر جب مسلمان اسپین میں آئے تو وہ اپنے ساتھ کاغذ بنانے کی ترکیب بھی لائے، جو انھوں نے مشرق میں سیکھی تھی، مگر یہ کام اس قدر آہستہ آہستہ ہوتا تھا کہ وقت کی ضروریات کو پورا نہ کرسکا اور پھر چھلی کے کاغذ بھی پندرھویں صدی میں یورپ میں بند ہو گئے۔ جب کہ دوسرا کاغذ درختوں کی چھال اور چھیتڑوں سے بننے لگا۔ ایشیا میں (MUBBERRY) کی چھال سے کاغذ بنایا گیا، مگر وہ ہاتھ سے بنایا جاتا تھا، اس لیے کافی گراں تھا اور اخبار جیسی چیزوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ ۱۹ ویں صدی کے شروع میں جدید طریقہ دریافت ہوا اور مشین سے کاغذ بننے لگا اور آج کاغذ درختوں کے تنے کاٹ کر روئی کے چھیتڑوں سے، لینن اور فلیکس کے بچے ہوئے بیکار حصوں سے بنایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بانس کے درخت سے کاغذ تیار ہوتا ہے، جو اخباروں کے کام آتا ہے۔

روشنی
SAMI-65

عشرت رحمانی

ڈرامے کے لوگ

(۱) ماں —— پہاڑی علاقے کے ایک گاؤں کی بڑھیا عورت

(۲) بابا —— پہاڑی علاقے کے ایک گاؤں کا بوڑھا محنتی کسان

(۳) شمی —— ان دونوں کی بیٹی، عمر تقریباً ۹ برس

(۴) شامو —— ان دونوں کا بیٹا، عمر تقریباً ۱۱ برس

(۵) ڈاکٹر —— گاؤں والوں کی بھلائی کے لیے شہر سے آکر یہاں رہنے لگا ہے، نہایت نیک، رحم دل آدمی ہے۔ سب کی مدد کرتا ہے۔

منظر

ایک پہاڑی علاقہ - ایک پرانی دیہاتی وضع کی چھوٹی سی جھونپڑی ہے، جس کی دیواریں کچی مٹی کی ہیں۔ دائیں جانب دروازہ ہے اور دیواروں میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ جھونپڑی کا اندرونی حصہ ہمارے سامنے آتا ہے اور دروازے کا اندرونی حصہ بھی۔ سامنے کی طرف ایک چارپائی پڑی ہے جس پر بستر نہیں ہے۔ دائیں جانب گوشہ میں ایک چھوٹا سا تخت بچھا ہے۔ اس پر ایک کپڑا پڑا ہے۔ تخت پر ایک ٹوکری دھری ہے اس میں آلو اور پیاز مع چھری رکھے ہیں۔ ایک طرف زمین پر پانی کا بڑا سا مٹکا ہے جس کے اوپر مٹی کا پیالہ ڈھکا ہوا ہے۔ ٹوکری کے پاس شمی بیٹھی ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو شمی اپنے کندھوں پر پڑی ہوئی چادر کا لٹکتا ہوا کونا پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے مروڑتی اور پھر اس کے دونوں کونوں کو جھٹک کر زور سے ہنس کر چھوڑ دیتی ہے۔ پھر جلدی سے دائیں ہاتھ سے چھری اور بائیں سے ایک آلو اٹھاتی ہے، اتنے میں شمی کی بوڑھی ماں اندر آتی ہے۔ جو چادر میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سامان سے لدی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں ہیں۔ شمی اُسے دیکھتے ہی جلدی سے چھری اور آلو تخت پر رکھ کر اٹھتی ہے اور دوڑ کر ماں کے پاس جاتی ہے۔ ماں تھکی ہاری ہانپ رہی ہے۔ جب بیٹی اس کے قریب پہنچتی ہے تو وہ بیٹی کو لپٹا کر مسکرانے لگتی ہے، جیسے اس کی ساری تکان دُور ہوگئی۔

شمی : ماں، آگئیں!

ماں : اُوہ بہت تھک گئی۔ سردی بھی تو بہت ہے

شمی : اور میری چیز لائیں ماں؟

ماں : کتنی بھیڑ تھی۔ توبہ توبہ! میں تو دیوانی ہوگئی

میلہ کیا تھا آفت تھی۔

شمی : پر وہ میری چیز لائیں؟

ماں : ہاں ہاں بتاتی ہوں۔

شمی : (بسور کر) اوں، نہیں لائیں کیا؟

ماں : اری لائی ہوں، لائی ہوں۔

شمی : (خوش ہوکر) آہا ہا۔ دکھاؤ نا کہاں ہے؟

ماں : توبہ، آدمی ہی آدمی اور آدمیوں سے زیادہ گائیں، بھیڑیں، بکریاں۔ بس جانور ہی جانور۔ چلنا بھی تو دوبھر ہوگیا۔

شمی : اونہہ۔ مگر وہ کہاں ہے؟

ماں : بیٹی، بس ادھر گائے اُدھر بھیڑ۔

شمی : اور وہ!

ماں : ذرا دم تو لینے دے (ہانپتی ہوئی تخت پر بیٹھتی ہے)

(شمی ماں کی ٹوکریوں میں سے ایک ایک چیز کو دیکھنے لگتی ہے)

شمی : کدھر ہے ماں؟

ماں : ادھر اس ٹوکری میں ہوگا۔

شمی : (ٹوکری میں سے نکالتے ہوئے) یہ تو لون کا پکھا ہے ماں!

ماں : ہاں ہاں، وہی تو۔

شمی : (بسورتے ہوئے) اوں۔ بھلا یہ کیوں لے آئیں۔

ماں : اری میری چادر اتنے دنوں سے ادھوری پڑی ہے۔ سردی آتی ہے، اُسے ختم کرلوں۔

شمی : اور میرا بھالو نہیں لائیں۔

ماں : لائی ہوں، لائی ہوں۔

شمی : تو نکالو نا، کہاں ہے۔

ماں : (نکالتی ہے) یہ لے دیکھ۔

شمی : (دیکھتے ہی خوشی خوشی کود کر کھلونا بھالو تھامتے ہوئے) آہا ہا، واہ وا، میرا بھالو کیسی مزے کی آنکھیں چمکاتا ہے۔

ماں : چابی دو تو آنکھیں مٹکاتا ہے۔

شمی : آہا ہا، کتنا پیارا ہے، بہت ہی پیارا۔ کیوں ماں!

ماں : اور ماں پیاری نہیں؟

شمی : ماں تو بہت ہی پیاری ہیں مجھے اتنا پیارا بھالو جو لاکے دیا۔ (ماں سے لپٹ جاتی ہے)

ماں : اور یہ دیکھ میٹھی گولیاں۔

شمی : واہ وا جی۔ شانو آئے گا تو اُسے بھی دوں گی گولیاں۔

ماں : آدھی تیری اور آدھی شانو کی۔

شمی : ہاں ہاں! بھالو کتنے کا ملا ماں، بہت مہنگا؟

ماں : ہاں اور کیا۔ اتنی بھیڑ تھی، جسے دیکھو بھالو لیں گے۔ میرے آتو سب بک گئے

بس میں نے بھی کہا کہ جتنے کا ملے گا ضرور لوں گی۔

شمی : ہائے! میری اچھی ماں، تو کتنے میں لیا؟

ماں : پورے پانچ روپے کا!

شمی : آہا، اب میں شامو کو نہیں دوں گی۔

ماں : تیرا بھائی ہے ری، اسے بھی کھیلنے دینا!

شمی : (منھ بنا کر) دیکھو نا۔ میں اس سے اپنے ساتھ کھیلنے کو کہتی ہوں، تو جھٹ منع کر دیتا ہے کہ مجھے تو کام پر جانا ہے۔ سبق یاد کرنا ہے۔ اب میں بھی کہہ دوں گی، مجھے اپنے بھالو کے ساتھ کھیلنا ہے۔

ماں : میرا شامو تو اتنا اچھا ہے۔ ذرا سا بچہ ہے اور اتنا کام کرتا ہے۔

شمی : اور بس کام کیے ہی جاتا ہے۔

ماں : کام کرنا تو اچھا ہے۔ بس ایک بات بری ہے کہ وہ کہتا ہے، میں اب شہر کو پڑھنے جاؤں گا۔

شمی : ہائے ماں، یہ تو بہت بری بات ہے۔

ماں : مانتا ہی نہیں۔ کیا کروں۔

شمی : ہمیں چھوڑ کے اتنی دور چلا جائے گا

ماں : ہاں، تیرے بابا کے ساتھ بھیڑیں کون چرائے گا؟

شمی : اور کھیتوں کا کام کون کرے گا؟

ماں : تیرے بابا سے کہوں گی نہ جانے دیں۔

شمی : ہاں، یہ تو اچھی بات نہیں ماں۔

ماں : مگر اسے تو شہر جا کے پڑھنے کی دھن لگی ہے۔

شمی : بابا نہیں جانے دیں گے۔

ماں : تیرے بابا بھی تو اس کی خوشی پر خوش ہیں۔ ان کو بڑے ڈاکڈر (ڈاکٹر) نے یہ سکھایا ہے۔ وہ اس کے کہنے میں ہیں۔

شمی : تم تو کہتی تھیں بڑے ڈاکڈر اچھے آدمی ہیں۔ پھر وہ بھیا کو بری بات کیوں سکھاتے ہیں۔

ماں : ہاں، وہ تو نیک اور اچھے آدمی ہیں۔ پر میرے شامو کو تو انھوں نے پڑھنے لکھنے کی عادت ڈال دی۔

شمی : تو کیا اچھے ہیں واہ! میرا بھالو ان سے اچھا ہے۔ کھیلتا ہے۔

ماں : ڈاکڈر صاحب تو اسے اور آگے پڑھنے کو کہتے ہیں۔ ہم محنتی مزدور لوگ ہمیں شہر والوں کی باتوں سے کیا لینا ہے۔ اپنے باپ دادا کا کام کریں۔ بھیڑیں چرائیں، کھیتی باڑی کریں۔ ہمیں یہی اچھا ہے۔

(شمی چپ چاپ زمین پر بیٹھی اپنے بھالو کو تک رہی ہے اور ماں کی باتوں کو بے دھیانی سے سن رہی ہے۔ پھر

ایک دم اُچھل پڑتی ہے، جیسے کوئی بھولی بات یاد آگئی)

شمی : ہاں، ماں وہ لمبردار (نمبردار) کی بیٹی کے پاس جو بھالو تھا نا وہ اُسے چابی لگاکر زمین پر چھوڑ دیتی تھی، پھر اس سے کہتی تھی،

بھالو بھالو آنکھیں مٹکاؤ
بھورے بھورے بادل لاؤ
کھیتوں میں پانی برساؤ

اور ماں، کہتے ہیں بھالو اس کا سچ مچ کہنا مانتا تھا۔ آنکھیں مٹکاتا ناچتا پھرتا، جیسے پانی برسنے کی دعا مانگ رہا ہو اور پھر مینہ برسنے لگتا تھا۔ اب میں بھی اپنے بھالو سے یہی کہوں گی ۔ اوں!

ماں : (بے خیالی سے) ہاں۔

شمی : ماں میرا بھالو بھی میرا کہنا مانے گا۔

ماں : ہاں ہاں کیوں نہیں۔

شمی : تو ماں، پھر بھیا آپ کا کہنا کیوں نہیں مانتا ؟

ماں : وہ بھی مانے گا۔

شمی : ماں بھیا کہنا نہیں مانے گا تو میں اپنے بھالو سے کہوں گی وہ دعا مانگے کہ بھیا کہیں نہ جائے۔

ماں : چل پگلی۔ بھلا یہ ننھا سا کھلونا کیا دُعا مانگے گا۔

شمی : سچ ماں، لمبردار کی بیٹی کہتی تھی، بھالو کی دعا بہت سچی ہے۔

ماں : اچھا اب تو جلدی سے آلو کاٹ لے، میں چولھا جلادوں، روٹی پکالوں، تیرے بابا کھیت سے آتے ہی ہوں گے۔

شمی : اچھا ماں، ابھی کاٹتی ہوں۔

ماں : (اُٹھتے ہوئے) چلوں جلدی سے سارا کام کرلوں۔ ابھی تو تیرے بابا آکے روٹی مانگیں گے۔

شمی : بابا اتنا کام کرکے آتے ہیں اُنھیں بھوک جو لگتی ہے ماں۔

ماں : ہاں وہی تو کہتی ہوں (ایک طرف چلی جاتی ہے)

(شمی ماں کے جانے کے بعد بھالو کو اُٹھاتی ہے، کچھ سوچتی ہے پھر جلدی سے چابی لگاتی ہے)

شمی : میں بھی اپنے بھالو سے کہتی ہوں۔ بھیا کے لیے دعا مانگے کہ کبھی کہیں نہ جائیں۔

(شمی بھالو کو چابی لگاکر زمین پر چھوڑ دیتی ہے اور تالیاں بجا بجا کر کہتی ہے)

"بھالو بھالو آنکھیں مٹکاؤ
بھیا سے بولو شہر نہ جاؤ
اپنے گاؤں میں کھیل کھلاؤ"
(بھالو زمین پر ریںگتا ہوا آنکھیں مٹکاتا ہے۔ شمی خوش ہوتی ہے)
شمی : آہا جی میرا بھالو دعا مانگتا ہے۔ اب بھیا شہر نہیں جائیں گے۔ گھر ہی میں کھیل کود مچائیں گے۔ واہ واہ جی
(ماں دوسری طرف سے آتی ہے)
ماں : یہ کیا کرنے لگی تو، آلو کاٹ لیے؟
شمی : ماں، میں نے بھالو سے کہہ دیا۔ وہ دعا مانگ رہا ہے اب بھیا کو شہر نہ جانے دیں گے۔
ماں : بس اب تو ہر وقت بھالو سے کھیلتی رہے گی، کام کاج کوئی نہیں کرے گی۔
شمی : ابھی کرتی ہوں ماں۔
ماں : میں نے آگ جلادی ہے۔ روٹی پکاتی ہوں تو آلو جلدی سے کاٹ لے تو پکالوں۔
شمی : ابھی لو ماں، ابھی کاٹتی ہوں۔
ماں : اور ہاں، میں بھول گئی۔ گھر میں لکڑیاں بھی نہیں ہیں۔ ذرا دوڑ کے پاس سے دو چار لکڑیاں چن لا۔ شامو بھیڑیں چرا کے آتا ہے تو ڈاگڈر صاب کے پاس چلا جاتا ہے، لکڑیاں کون لائے۔
شمی : اسی لیے تو کہتی ہوں بھیا شہر چلے گئے تو پھر بھیڑیں بھی کوئی نہیں چرائے گا۔
ماں : اچھا تو جلدی سے لکڑیاں تو لے آ۔
شمی : وہ تو لاتی ہوں (دوڑتی ہوئی باہر جاتی ہے)
(بابا (باپ) باہر سے اندر آتا ہے)
ماں : آ گئے شمی کے بابا!
بابا : شمی کہاں ہے؟
ماں : آگ جلانے کو لکڑیاں لینے گئی ہے۔
بابا : لکڑیاں ختم ہو گئیں کیا؟ اس دن تو میں ڈھیر سی لایا تھا۔
ماں : اب میں نے کھا تو نہیں لیں لکڑیاں۔ سب جل گئیں۔
بابا : تم تو بیکار جلی کٹی باتیں کرنے لگیں۔ لکڑی جلنے ہی کے لیے آتی ہیں۔
ماں : رات کو آگ تاپنے میں بھی جلتی ہیں۔
بابا : ہاں، ہاں ٹھیک ہی ہے۔ کھانا تیار ہو گیا؟
ماں : ابھی تھوڑی دیر میں ہو جاتا ہے تیار۔
بابا : کوئی بات نہیں۔ ہو ہی جائے گا۔
(شمی لکڑیاں اٹھائے ہوئے آتی ہے)
شمی : لو ماں، کتنی ڈھیر ساری لکڑیاں لے آئی۔
بابا : شاباش، میری بیٹی! تو بڑے کام کی ہے۔

ماں : یہ بیٹی تو میری ہے۔ تمھارا بیٹا تو وہ ہے، جو رات دن بیکار پڑھنے میں وقت گزارتا ہے، نہ کام کا، نہ کاج کا۔

بابا : نہ، نہ ایسا نہ کہو شمی کی ماں۔ وہ تو بہت اچھا بیٹا ہے۔ کام بھی کرتا ہے۔ پڑھتا بھی ہے۔ دیکھنا، ایک دن کیسا بڑا آدمی بن جائے گا وہ۔

ماں : نہ کوئی بڑا آدمی۔ شہر جا کے اور آفت ہوگی۔

بابا : پڑھ لکھ کے ڈاگڈر بنے گا، پھر سارا گاؤں اسے مانے گا سب کے کام آئے گا۔

ماں : اور یہ بھیڑوں کا کیا بنے گا۔ ان کی کون دیکھ بھال کرے گا۔ تمھارا کھیتی باڑی میں کون ہاتھ بٹائے گا؟

بابا : سب ہو جائے گا، نیک بخت!

ماں : کچھ بھی تو نہیں ہوگا۔ میں کہتی ہوں یہ ڈاگڈر اچھا نہیں کر رہے ہمارے ساتھ لے کے شامو کو بگاڑ دیا ہے اور تم ہو کہ اُس کے کہنے پر چل رہے، بیکار، ہونہہ!

بابا : اری بھلی مانس بیکار نہیں بڑے کام کی باتیں ہیں یہ۔

ماں : میں تو نہیں مانتی۔ میں آپ ڈاگڈر کے پاس جا کے کہہ دوں گی ایک دن کہ صاحب ہمارے بچے کا پیچھا چھوڑو۔

بابا : دیوانی ہوئی ہو۔ ڈاگڈر کتنا نیک آدمی ہے۔ ہم پر اس کے اتنے احسان ہیں۔ ہمارے بھلے کے لیے کر رہے ہیں سب کچھ۔ اُنھیں کیا پڑی ہے جو اپنا وقت خراب کریں اور شامو کو پڑھائیں ہمیں تو خوش ہونا چاہیے۔

ماں : ہمارا بچہ ہم سے چھٹ جائے اور ہم خوش ہوں۔ واہ جی، یہ خوب رہی۔

بابا : ناسمجھی کی باتیں نہ کر۔ ہمارے گاؤں کے سب بچے لکھیں پڑھیں تو سارا گاؤں سُکھی اور سمجھ دار بن جائے گا۔

ماں : بڑے سکھی اور سمجھ دار بن جاتے یہ سمجھ کی بات ہے کہ سب پڑھتے لکھتے اور کھیتی باڑی بیل بھیڑیں کرتی پھرتیں۔ کھاتے کہاں سے؟

بابا : دیوانی۔ کھیتی باڑی بھی آدمی کرتے اور اب بھی بڑی عمر کے لوگ کھیتی باڑی کریں بچے پڑھیں لکھیں۔

ماں : اچھا اچھا تم سارے گاؤں کو پڑھاؤ جو چاہے کرو، پر میں کہے دیتی ہوں میرا شامو شہر نہیں جائے گا۔

بابا : میں نے کب کہا ہے کہ وہ جائے؟

ماں : بس ہاں ٹھیک ہے۔
بابا : پر وہ تو آپ ہی جانے کو کہتا ہے۔
ماں : (جل جاتی ہے) پھر وہی اُلٹی بات۔ تم اسے منع کرو تو کیوں جائے!
بابا : میں اس کی بُرائی کیوں چاہوں جو منع کروں!
ماں : تمھارا جو جی چاہے کرو۔ میں تو اسے نہ جانے دوں گی۔
بابا : نیک بخت اب روٹی کا بندوبست بھی کرے گی یا جھگڑتی رہے گی۔
ماں : وہی تو کرنے جارہی تھی۔
بابا : ہاں، جلدی کر۔ بڑی بھوک لگی ہے۔
ماں : ایندھن کا رونا نہ ہوتا تو کبھی کا پکا چکی ہوتی۔
بابا : ارے ہاں۔ یاد آیا، ایک چیز دکھاؤں؟
ماں : بس جی تم رہنے دو اپنی چیزیں۔ میں چلی چولھا جھونکنے۔
بابا : دیکھ تو تیرے ہی کام آرام کی چیز ہے۔ آگ اچھی جلے گی۔
ماں : کیا ہے، بھلا دکھاؤ؟
بابا : (تھیلے سے نکالتے ہوئے) یہ دیکھ ولایت سے آئی ہے۔
(ایک چھوٹی سی بتی فتیلہ نما بیوی کو دکھاتا ہے)
ماں : یہ کیا ہے؟
بابا : آگ جلانے کی ولایتی بتی ہے۔
ماں : تمھیں کیسے ملی۔ کہیں سے چوری کر لائے۔ چھی چھی۔
بابا : سچ مچ تُو تو بڑی ناسمجھ ہے۔ اتنی عمر آگئی سمجھ نہ آئی۔
ماں : پھر بتاؤ نا کہاں سے آئی؟
بابا : میں بڑی سے بڑی چیز کی چوری کر کے اپنا ایمان نہ بگاڑوں تو یہ ذرا سی چیز چُرا کے لاتا۔
ماں : تو تمھیں کس نے دی ہے۔
بابا : ادھر پہاڑی پر جو افسر لوگ کام کر رہے ہیں انھوں نے دی ہے۔
ماں : تو اس سے آگ کیسے جلتی ہے؟
بابا : اسے چولھے میں رکھ دے اور دیا سلائی دکھا دے، آگ بھڑک اُٹھے گی۔
ماں : نا، بابا۔ میں اسے کچھ نہ کروں گی جانے کیا بلا ہے۔
بابا : بھلی مانس وہ جو شہر سے بڑے بڑے افسر لوگ آئے ہیں۔ بڑے نام کے کاری گر۔ ان کے پاس پہاڑیوں کو توڑ کر پتھروں کو اُڑانے کا جو سامان ہے وہ اس سے کام لیتے ہیں۔ اس ڈبہ میں بیسیوں بتیاں ہیں۔ یہ دیکھ!

ماں : اس سے سچ مچ آگ جلتی ہے ؟
بابا : اور کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں !
ماں : پھر تو بڑے کام کی چیز ہے۔ اچھا پھر دیکھوں گی، پہلے روٹی پکالاؤں۔
(شمی اس دوران چپ چاپ بیٹھی اپنے بھالو سے کھیل رہی ہے۔ ماں کے جانے کے بعد باپ سے مخاطب ہوتی ہے)
شمی : بابا، ماں میرے لیے بھالو لائی ہیں۔ دیکھو کتنا پیارا ہے۔
بابا : اوہو، یہ تو بہت اچھا ہے۔ واہ بھئی واہ۔
شمی : بابا! میں نے اپنے بھالو سے کہہ دیا ہے، اب یہ بھیا کو شہر نہیں جانے دے گا۔
بابا : یہ کیسے روکے گا بیٹی ؟
شمی : یہ دعا مانگے گا اور بھیا نہیں جائے گا۔
بابا : پگلی، بھلا یہ کیسے ؟
شمی : بس دیکھنا بابا، میں نے جو کہہ دیا۔
بابا : ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹی، تیرا بھیا پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بنے گا، پھر تجھے شہر سے اچھے اچھے کھلونے لا کے دے گا۔
شمی : پَر وہ اتنی دُور جو چلا جائے گا۔
بابا : پھر کیا ہوا بیٹی وہ آجائے گا۔
شمی : وہ جلدی آجائے گا نا بابا؟
بابا : ہاں ہاں، کھلونے لے کے آئے گا۔ اب اپنے بھالو سے کہہ دے کہ وہ دُعا مانگے کہ تیرا بھیا پڑھے لکھے اور بڑا آدمی بنے۔
شمی : اچھا، تو میں اس سے کہوں گی۔
بابا : ہاں، شاباش، میں ہاتھ منھ دھولوں پھر روٹی کھائیں گے۔
(بابا باہر جاتا ہے)
(شمی بھالو کو چابی لگاتی ہے اور زمین پر رکھ کر اسے چلاتے ہوئے کہتی ہے)
شمی : "بھالو بھالو آنکھیں مٹکاؤ
بھیا کو میرے پڑھنا سکھاؤ
ہنستے جاؤ سب کو ہنساؤ
بھالو بھالو آنکھیں مٹکاؤ"
(شامو اندر آتا ہے۔ شمی جلدی سے بھالو کو اُٹھا کر مٹھی میں چھپا لیتی ہے۔)
شامو : اوہو۔ یہ میری بھیڑیں بھی مصیبت ہیں۔ کہنا ہی نہیں مانتی۔ ٹیڑھی ہی چلتی ہیں۔ اَن پڑھ کہیں کی۔
شمی : (ہنس کر) بھیا کہیں جانور بھی پڑھتے ہیں؟
شامو : دیکھ نا۔ جیسے پلے بڑھے لوگ نا سمجھی

کی باتیں کرتے ہیں، ایسے ہی یہ اُلٹی چلتی ہیں۔ اَن پڑھ بھی جانور کے برابر ہوتے ہیں۔

شمی : (چڑھ کر) اچھا جی تو ہم جانور ہیں؟
(شمی ماں کی گود میں جھومنے لگتی ہے)

شامو: نہیں اری، میں نے تو بھیڑوں کو کہا ہے اچھا روٹی تو بھیج۔

شمی : ماں پکارہی ہیں۔ ابھی لاتی ہیں۔

شامو: بابا کہاں ہیں؟ آئے نہیں ابھی۔

شمی : آ گئے، ہاتھ منھ دھو رہے ہیں۔

شامو: مجھے تو بڑی دیر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا ہے۔ سبق پڑھنا ہے۔

شمی : (کھلونا دکھاکر) یہ دیکھو میرے پاس کیا ہے!

شامو: آہا، یہ تو بہت خوب صورت بھالو ہے۔

شمی : آؤ، تم بھی کھیلو۔

شامو: نہیں، بے کار وقت خراب ہوتا ہے۔

شمی : ہوں، تو پڑھنے سے کیا ہوتا ہے؟

شامو: بہت کچھ، نئی نئی کام کی باتیں آتی ہیں دیس دیس کا حال معلوم ہوتا ہے۔ سمجھ بوجھ اچھی ہوتی ہے۔

شمی : اونھو، بڑی سمجھ!

شامو: (تخت پر تیلیوں کا ڈبہ دیکھتا ہے) اور اس ڈبے میں کیا ہے؟

شمی : جانے کیا ہے؟

شامو: یہ کون لایا ہے؟

شمی : ابا لائے ہیں، کوئی آگ جلانے کی بتی ہے۔

شامو: (ڈبے کو غور سے دیکھتا اور پڑھتا ہے)
ڈ-ا-ء-ن-ا-م-ی-ٹ
ارے یہ بتی ہے۔ یہ تو ڈائنامیٹ ہے

شمی : وہ کیا ہوتا ہے؟

شامو: اس سے آگ تو جلاتے ہیں۔ مگر ہر کسی سے اس سے کام نہیں لیا جاسکتا اگر اسے آگ میں رکھ دیں تو ساری جھونپڑی ابھی اُڑ جائے گی۔

شمی : ہائے، بابا تو کہتے تھے اس سے آگ جلاؤ۔

شامو: سچ؟

شمی : ہاں ہاں سچ!

شامو: ماں کہاں ہیں؟

شمی : چولھے کے پاس روٹی پکاتی ہیں۔

شامو: اس میں سے کوئی بتی لے کے تو نہیں گئیں۔

شمی : مجھے کیا خبر

شامو: اوہ - خدایا (چلاتا ہوا جاتا ہے) ماں ماں
(شامو کے اندر جانے کے بعد ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

شمی : سلام صاحب!

ڈاکٹر: خوش رہو۔ تمھارے بابا کہاں ہیں؟
شمی: وہ ادھر باہر گئے ہیں۔
ڈاکٹر: اور شامو کہاں ہے؟
شمی: وہ ابھی ماں کے پاس اندر گیا ہے۔
[اتنے میں ماں اور شامو باتیں کرتے ہوئے آتے ہیں اور دونوں ڈاکٹر کو سلام کرتے ہیں اور بابا بھی آجاتا ہے۔]
ڈاکٹر: بابا کہو سب ٹھیک ہے نا؟
بابا: ہاں جی، آپ کی مہربانی۔ میں ابھی یہ ڈبہ لایا تھا جی۔ اس میں بتیاں ہیں آگ جلانے کے لیے۔
ماں: اور شامو کہتا ہے یہ۔ یہ جانے اس سے کیا ہو جاتا ہے۔
ڈاکٹر: کہاں ہے وہ ڈبّہ؟
شامو: [تخت سے ڈبّہ اُٹھاکر جو وہ جلدی میں وہیں رکھ گیا تھا۔]
یہ ہے ڈاکٹر صاحب! دیکھیے اس پر کیا لکھا ہے۔
ڈاکٹر: یہ تو ڈائنا میٹ ہے۔ بھک سے اُڑنے والا مادّہ۔
شامو: یہی تو میں کہتا ہوں ڈاکٹر صاحب!
بابا: تو اس سے کیا ہوتا ہے ڈاگڈر صاب؟
ماں: کوئی بُری چیز ہے جی؟
ڈاکٹر: یہ تو بس ایسا ہے جیسے بم کا گولہ۔
بابا: یہ تو جی مجھے پہاڑی والے صاب نے دیا تھا۔
ڈاکٹر: کیا انھوں نے تم سے کہا تھا کہ گھر لے جاؤ اور اس کو اپنے کام میں لاؤ۔
بابا: بس اُنھوں نے کہا کہ لو یہ رکھو۔
ڈاکٹر: تم کو ضرور کچھ بھول ہوئی ہے۔
بابا: بھول؟ وہ کیسے صاب
ڈاکٹر: اب میں کیا بتا سکتا ہوں۔ بھئی، یہ تو پہاڑی کو توڑنے کے لیے کام میں لا رہے ہیں۔
بابا: ہاں جی، وہ تو میں جانتا ہوں۔ میں نے ان صاب سے پوچھا تھا کہ یہ آگ کیسے نکلتی ہے تو انھوں نے کہا اس سے ہی نکلتی ہے۔
ڈاکٹر: بالکل ٹھیک ہے سارے پتھر پہاڑی سے ٹوٹ ٹوٹ کر اُڑتے ہیں۔ اس پہاڑی کے اندر لوہے کی کان کا پتہ چلا ہے، اسے صاف کر کے کھُدائی کریں گے اور لوہا نکالیں گے۔ اسے آگ دکھاؤ تو سب کچھ اُڑ جاتا ہے۔
ماں: تو میں اسے چولھے میں رکھ کر دیا سلائی دکھاتی، پھر کیا ہوتا صاب؟

ڈاکٹر : ساری جھونپڑی اُڑ جاتی ۔
ماں : ہائے اللہ! ہم تو بچ گئے ۔
بابا : یہ شامو نے بچایا ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر بعد جھونپڑی میں آتا۔
ماں : (جلدی سے بات کاٹ کر) وہ کیوں آتا۔
بابا : وہ کیوں ؟
ماں : اگر میں تمھارے کہنے سے آگ جلانے لے جاتی تو ہم سب اُڑ جاتے جھونپڑی یہاں کہاں ہوتی!
بابا : یہ بھی ٹھیک ہے۔
(باہر سے کسی کی آواز آتی ہے)
بابا، بابا! یہاں تو آؤ۔
ماں : یہ کون پکارتا ہے۔ تمھیں بلا رہا ہے (بابا سے)
بابا : میں دیکھتا ہوں۔ (جاتا ہے)
ڈاکٹر : سچ تو یہ ہے کہ تم لوگوں کو خدا نے بچالیا۔
ماں : یہ آپ نے بچایا ہے صاب !
ڈاکٹر : بھلا میں نے کیا کیا ؟
ماں : آپ نے شامو کو پڑھایا۔ وہ پڑھنا نہ جانتا تو اس ڈبے کا پتہ نہ چلتا اور ہم اُسے جلاکر سب کے سب جل جاتے ۔
(بابا گھبرایا ہوا آتا ہے)
بابا : وہ پہاڑی والے صاب کا اردلی آیا ہے۔ کہتا ہے وہ ڈبہ تم نے کہاں رکھا ہے ؟
ماں : تم تو کہتے ہو صاب نے تمھیں آگ جلانے کو دیا تھا۔
بابا : یہی تو بھول ہوئی مجھ سے۔ اس نے بتایا کہ صاب تو بہت گھبرا رہے ہیں کہ نہ جانے وہ ڈبہ کہاں لے گیا میں۔
ڈاکٹر : تو کیا ان صاحب نے تمھیں نہیں دیا تھا؟
بابا : صاب، بات یہ ہوئی کہ صاب کے ہاتھ میں یہ ڈبہ تھا۔ میں وہاں جا کے کھڑا ہوگیا۔ صاب اکیلے کھڑے تھے۔ وہ کچھ لکھنے لگے۔ میرے ہاتھ میں یہ ڈبہ دیا کہ لو یہ۔ (ہنستا ہے) میری ناسمجھی تھی، میں نے سمجھا یہ مجھے دے دیا۔
ڈاکٹر : میں نہ کہتا تھا کہ اس میں کوئی بھول ہے۔
بابا : ہاں صاب! بڑی بھول۔ وہ صاب دوسری طرف کسی سے بات کرنے گئے اور میں یہ ڈبہ اپنا سمجھ کر لے کے گھر چلا آیا۔
ماں : اور مجھ سے کہہ دیا کہ اس سے آگ جلاؤ۔
بابا : سمجھ ہی نہ آئی نا۔ میں روز دیکھتا تھا اس سے پتھر اُڑاتے ہیں۔ آگ نکلتی ہے۔ بس میں نے جانا یہ مجھے دے رہے ہیں۔ میں بھی اس سے آگ جلالیا کروں۔
ڈاکٹر : بڑی خیریت ہوگئی بابا، ذرا سی بھول چوک سے کیا کچھ ہوجاتا ہے۔

بابا : پچ ہے صاب، میں آگیا تو اردلی کہتا ہے صاب نے مجھے ڈھونڈنے کو آدمی دوڑائے اور یہ بے چارہ دوڑتا ہوا یہاں آیا ہے ۔

[شمی اور شامو چپ چاپ کھڑے ایک ایک کا منھ دیکھ رہے ہیں ۔]

بابا : اور صاب مجھے تو بڑی لاج آرہی ہے ۔ وہ صاب کہتے ہوں گے میں چوری کرکے لے آیا ہوں ۔

ڈاکٹر : نہیں اس میں چوری کی کیا بات ہے ۔ تم سے بھول ہوگئی ۔ اردلی کو ڈبہ دے دو اور کہہ دو کہ میں سمجھتا تھا مجھے دیا ہے بس ۔

بابا : (ڈبہ لے کر) کہہ تو دوں ۔ پَر ہے بڑی شرم کی بات صاب !

[ڈبہ لے کر باہر جاتا ہے ۔ شامو اُس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے ۔]

ماں : بیٹھو نا صاب ! میں تو ایسی گھبرائی کہ بھول گئی ۔ آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں ۔

ڈاکٹر : نہیں کوئی بات نہیں ۔ بس میں چلتا ہوں ۔ شامو کو دیکھنے آیا تھا ۔

[بابا اور شامو آتے ہیں ۔ بابا خوشی خوشی مسکرا رہا ہے ۔]

ماں : ڈبہ دے دیا نا !

بابا : ہاں آں، دے دیا ۔ پڑھائی میں بڑی طاقت ہے ۔

ماں : ہے تو سہی ۔ شامو ڈبے کو نہ پڑھے تو آج ہم سب خاک میں مل گئے تھے ۔

بابا : شامو میں پڑھائی سے کتنی سمجھ آگئی ہے ۔ اس نے اردلی سے کہا، بھائی میرے بابا بھول سے لے آئے ڈبہ ۔ اپنے صاب سے ان کی طرف سے ہاتھ جوڑ کے اس غلطی کی مافی (معافی) مانگنا اور اردلی نے خوش ہو کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ کہا، تم مت گھبراؤ، میں صاب کو سب سمجھا دوں گا ۔ کوئی بات نہیں ہے ۔

ماں : (شامو کو لپٹا کر) شاباش ! میرا کیسا پیارا بیٹا ہے ۔

بابا : (شامو کو اپنی طرف کھینچ کر) نہیں جی، تم کہہ چکی ہو یہ تو میرا بیٹا ہے تمھارا کب ہے ۔

ماں : (ہنستی ہے) وہ تو میں ہنستی تھی ۔

بابا : یہ تو ڈاکٹر صاحب کی مہربانی ہے کہ انھوں نے شامو کو ایسا سمجھ دار بنا دیا ۔

شامو : بابا، ڈاکٹر صاحب نے ہمیں نئی زندگی دی ہے ۔

ڈاکٹر : مجھے تو خوشی ہے کہ میں تم لوگوں کے کسی کام آیا ۔

بابا اور ماں (یک زبان ہوکر) سچ ہے ڈاگدر صاحب دیوتا ہیں۔

شامو: مجھے ڈاکٹر صاحب نے آدمی بنا دیا۔

ڈاکٹر: یہ تمہاری محنت کا پھل ہے شامو! جو بچے محنت کرکے پڑھتے لکھتے ہیں وہ سمجھ دار اور لائق بن کر سب کام ٹھیک کرتے ہیں۔

بابا: یہ سب آپ ہی نے بنایا ہے صاب!

ماں: سچ ہے؟

بابا: پر ڈاگدر صاب! شامو اب شہر جائے گا؟

ڈاکٹر: نہیں، اب اسے شہر جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ماں: سچ صاب؟

بابا: وہ کیسے؟

شمی: بھیا کو شہر نہیں بھیجیں گے نا صاب!

ڈاکٹر: نہیں بیٹی!

شامو: کیوں ڈاکٹر صاحب! میں شہر ضرور جاؤں گا پھر میں آگے کیسے پڑھوں گا؟

بابا: ہاں صاب، اب یہ آگے نہیں پڑھے گا کیا؟

ڈاکٹر: کیوں نہیں! بات یہ ہے کہ آج سرکار کی طرف سے حکم آیا ہے کہ لوہے کی کان نکالنے کے لیے اس گاؤں میں شہر سے بہت سے کاری گروں کو لا رہے ہیں۔ بہت سے انجینیر اور افسر بھی آئیں گے۔ ان سب کے رہنے کو نئے مکان بنیں گے۔ گاؤں کی آبادی بھی بڑھ جائے گی اور چھوٹے سے شہر کی طرح بن جائے گا۔ ایک اسکول بھی بنایا جائے گا اور سب لوگوں کے بچے وہیں پڑھیں گے۔

شامو: آہا ہا! میں اسکول میں پڑھوں گا۔

ڈاکٹر: ہاں، ابھی ضرور پڑھو گے۔ ہم تمھیں شہر اسی لیے بھیج رہے تھے کہ یہاں اسکول نہیں تھا اب یہیں سب کچھ ہوگا۔

(دھماکے کی زوردار آواز سنائی دیتی ہے)

ماں: (اُچھل کر) ہائے اللہ، یہ کیا ہوا؟

ڈاکٹر: یہ پہاڑی اُڑائی جا رہی ہے۔ اس کے دھماکے ہیں۔

شامو: اور ماں، یہ سب اس بتی سے ہو رہا ہے جس سے تم چولہا جلانے کو کہتی تھیں۔

ماں: ہائے، نہیں رے، چُپ۔

بابا: کیسی کیسی نئی باتیں ہونے لگی ہیں صاب! یہ دُنیا نئی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر: یہ سب علم کی برکت ہے اب تمہارا شامو بھی پڑھ لکھ کر ایک دن انجینیر بن جائے گا، پھر اسی طرح کے کام کیا کرے گا۔

بابا: میں تو شامو کو ڈاگدر بناؤں گا صاب۔ گاؤں کے لوگوں کے کچھ کام آئے گا!

ڈاکٹر : ہاں، کیوں نہیں!

شمی : بھیا شہر نہیں جائے گا۔ کیوں نا (شامو سے)

شامو : ہاں، میں یہیں اسکول میں پڑھوں گا۔

شمی : میں بھی پڑھوں گی۔

ڈاکٹر : شامو گاؤں کے سب بچوں سے آگے ہوگا۔

بابا : میرا شامو بیٹا بہت اچھا ہے۔

ماں : اور میری شمی بھی اچھی بنے گی۔ وہ بھی پڑھے گی۔

ڈاکٹر : بے شک، جو لکھے پڑھے گا، وہ اچھا بنے گا۔

شمی : (تالیاں بجاتی اور خوش ہوتی ہے) آپا جی، میں تو اچھی بنوں گی۔

بابا : ہم کتنے خوش نصیب ہیں!

ڈاکٹر : خدا آپ سب کو خوش رکھے اور بچوں کے نصیب اچھے ہوں۔

بابا : آپ کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر : یہ سب علم کی روشنی ہے۔ جیسے یہ ڈائنامیٹ ایک دم سب کچھ اُڑا پھینکتا ہے۔ اسی طرح اب یہاں تعلیم کی روشنی نا سمجھی اور جہالت کے اندھیرے کو اُڑا دے گی اور خوشی چین پھیلا دے گی۔

شمی : (خوشی خوشی اپنا بھالو ڈاکٹر کو دکھاتی ہے) صاحب! یہ میرے ننھے بھالو نے دُعا مانگی تھی۔ بھیا کو شہر نہیں جانے دیا۔ کیسا اچھا ہے میرا بھالو۔ کیوں نا!

ڈاکٹر : بہت اچھا۔ تو میں اب چلتا ہوں۔ شامو تم جلدی آکے آج کا سبق پڑھنا۔

شامو : جی، بہت اچھا!

[ڈاکٹر جاتا ہے۔ سب ایک ایک کر کے سلام کرتے ہیں اور ڈاکٹر سب کو سلام کا جواب دیتا رخصت ہوجاتا ہے۔]

شمی : دیکھا، ماں! میرا بھالو کیسا پیارا ہے۔ بابا میں نے جو کہا تھا، بھیا شہر نہیں جائے گا۔

بابا : ہاں، ہاں!

جلدی جلدی بھالو کو کوک دیتی ہے اور زمین پر چھوڑ کر اسے چلاتی ہے۔ پھر دونوں بہن بھائی ہاتھوں میں ہاتھ لیے بھالو کے چاروں طرف ساتھ ساتھ پھرتے ہیں اور شمی کہتی جاتی ہے

بھالو بھالو آنکھیں مٹکاؤ

ساتھ ہمارے خوش ہو جاؤ

شامو کہتا ہے۔

پڑھو، پڑھاؤ

لکھو، لکھاؤ

[دونوں ہنستے ہیں۔ ماں اور باپ خوش ہوتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے۔]

(بقیہ خوشی کا کھیل)

رہنے لگی - وہ پہلے سے زیادہ بڑی اور سمجھ دار ہو گئی تھی۔ گھر کے کام کاج میں نوکروں کی نگرانی کرتی۔ سینا پرونا سیکھتی، لکھتی پڑھتی اور محلہ بھر کی چھوٹی بڑی سب لڑکیوں کو اس نے خوش رہنے کا وہ کھیل سکھا دیا، جو اس نے اپنے باپ سے بچپن میں سیکھا تھا کہ ہر حال میں خوش رہو۔ اسی میں بہتری ہے۔ مدرسہ اور گھر میں سب ہی اس سے بہت پیار کرتے۔ پھوپھی نے دیکھا کہ شوشو نے اس کے گھر کو ایسا سنبھال لیا کہ سارے نوکر پہلے سے زیادہ محنت سے اپنے اپنے کام کرنے لگے اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ننھی شوشو بڑی ہوئی۔ اس کی بوڑھی پھوپھی نے اپنی ساری جائداد کا انتظام بھی اس کے سپرد کر دیا اور اس کے اچھے برتاؤ اور پیار محبت سے نوکر چاکر خوشی خوشی پہلے سے زیادہ اچھا کام کرنے لگے۔ جائداد کی آمدنی بھی بڑھ گئی۔ شوشو کی نیکی، محنت اور صبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھوپھی نے ساری جائداد اس کے نام کر دی اور شہر بھر میں اس کی نیکیوں اور بھلائیوں کی دھوم مچ گئی۔

ہنسو اور خوش رہو

سلیم رضا

ہیڈ ماسٹر: اسٹیشنری کسے کہتے ہیں؟
شاگرد: جناب اسٹیشن کی دکان کو۔

ہیڈ ماسٹر: (کلاس ٹیچر سے) کلاس میں خاموشی رہنے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟
کلاس ٹیچر: جناب تمام لڑکوں کی چھٹی کر دی جائے۔

گائڈ: جو شخص بھی آج تک اس پہاڑ پر چڑھا ہے واپس نہیں آیا۔
سیاح: (گھبرا کر) تو پھر کہاں گیا؟
گائڈ: وہ دوسری طرف سے اتر گیا۔

ماں: ننھی! تم موزے پہن کر پاؤں کیوں دھو رہی ہو؟
ننھی: اماں! پانی بہت ٹھنڈا ہے۔
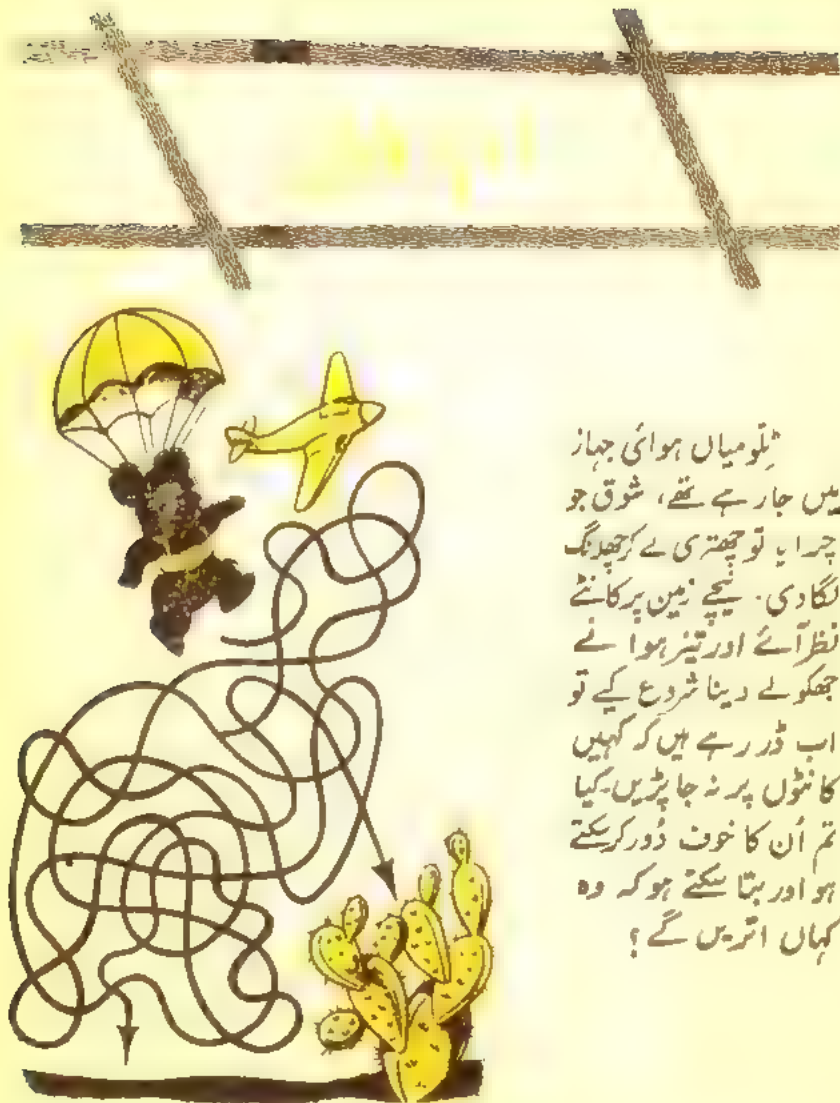
ٹلّو میاں ہوائی جہاز میں جا رہے تھے، شوق جو چرایا تو چھتری لے کر چھلانگ لگا دی۔ نیچے زمین پر کانٹے نظر آئے اور تیز ہوا نے جھکولے دینا شروع کیے تو اب ڈر رہے ہیں کہ کہیں کانٹوں پر نہ جا پڑیں۔ کیا تم اُن کا خوف دُور کر سکتے ہو اور بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں اتریں گے؟

حبیب اعجاز، کراچی

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔ جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو!

فرح عزیز، کراچی

فرحت رفیق، لائل پور

نور الدین، کراچی

راشد زماں ، کراچی

یوسف جمال خالد، کراچی

شہناز پروین ، کراچی

روبینہ شمس ، کراچی

نوشین زہرہ ،

انعامی کارٹون

۹

اس کارٹون کا عنوان بتاؤ!

صحیح عنوان لکھ کر بھیجنے والے نونہال کو ایک کتاب انعام میں دی جائے گی۔ ایک سے زیادہ صحیح جواب آنے کی صورت میں انعام کے لیے ایک نام قرعہ کے ذریعہ نکال لیا جائے گا۔ ادارہ کا فیصلہ قطعی مانا جائے گا۔

بجلی کی شرارت نے کپڑے جلا دیے

فرانس کے شہر پراڈیٹی کے لوگ ایک دن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا میر بلدیہ (میئر) بغیر کسی لباس کے چھپتا چھپاتا سڑک پر جا رہا ہے۔ یہ ۲۹۔ جون ۱۸۶۹ء کی بات ہے۔ ہوا یوں کہ میر بلدیہ جو انتہائی شریف آدمی تھا، کھیتوں میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا، مگر اس درخت پر بجلی گر پڑی۔ میر بلدیہ کو چوٹ تو نہ آئی، مگر بجلی سے اس کا پورا لباس جل گیا اور وہ برہنہ حالت میں چھپتا چھپاتا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

افریقہ کا اژدھا سانپ عام طور پر تیس فیٹ لمبا ہوتا ہے۔ یہ اپنے شکار کو کچل کر کھا جاتا ہے۔ جب یہ اپنے شکار کو کھاتا ہے تو اپنے منھ کو پھیلا کر دانت الٹ لیتا ہے اور بڑے سے بڑے شکار کو آسانی سے نگل جاتا ہے۔ اژدہے کے اعضا کچھ اس قسم کے بنے ہوتے ہیں کہ یہ کسی چیز کو ایک بار منھ میں رکھنے کے بعد اگل نہیں سکتا۔ ایک بار افریقہ میں ایک شکاری نے دیکھا کہ دو اژدھے ایک بڑے ہرن کو دونوں طرف سے نگل رہے ہیں۔ دونوں نے آدھا جانور ہضم کر لیا تو ایک لمحے کے لیے رکے۔ ہرن کا آدھا جسم ایک سانپ کے پیٹ میں اور آدھا دوسرے کے پیٹ میں تھا۔ دونوں کے لیے اگلنا ناممکن تھا۔ بڑے سانپ نے اپنا منھ کچھ

اور کھولا اور بقیہ ہرن کے ساتھ دوسرے سانپ کو بھی نگل گیا۔
ایک دفعہ ایک اژدھا پورے مگرمچھ کو نگل گیا تھا۔

پھول اتنے خوب صورت کیوں ہوتے ہیں

پھول کا کام بیج بنانا ہے، جن سے نئے پودے پیدا ہوتے ہیں۔ بیجوں کی پیداوار میں کیڑوں کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ وہ پھول پر سے پیلا زیرہ اسی قسم کے دوسرے پھول پر لے جاتے ہیں۔ اس کے بغیر بیج نہیں پیدا ہو سکتے۔ چناں چہ پھول کے اس اہم کام کے لیے ضروری ہے کہ پھول جیسے ہی کھلے کیڑوں کو معلوم ہو جائے۔ کیڑوں کو یہ اطلاع پھول کی رنگینی خوب صورتی اور خوشبو کے ذریعہ ملتی ہے۔ پھول کے خوب صورت ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے اور دوسری یہ کہ دیکھنے والوں کو خوشی حاصل ہو۔

بارش۔ عجیب وغریب اور رنگین

صحارا کے ریگستان میں کچھ علاقے ایسے بھی ہیں، جہاں بادل چھا جاتے ہیں اور بارش بھی ہوتی ہے، لیکن بارش کے قطرے زمین تک نہیں پہنچ پاتے، کیوں کہ صحارا کی گرمی کی وجہ سے بارش کے قطرے فضا ہی میں بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں۔ اس طرح صحارا کے یہ علاقے بارش کے باوجود بارش کی نمی سے محروم رہتے ہیں۔

یورپ کے لوگ اکثر "سرخ بارش" سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے لوگ اس بارش کو "خون آلود" قرار دے کر قہر کی علامت بتاتے تھے، مگر اب اس کی وجہ معلوم ہو چکی ہے۔ درحقیقت یورپ کے جنوب میں افریقہ کا عظیم ریگستان صحارا ہے، جہاں سے گرد کے طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ اس طرح یورپ کی فضا پر ریگستان کی سُرخ ریت کے ذرّات چھا جاتے ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو وہ سرخی مائل ہوتی ہے۔
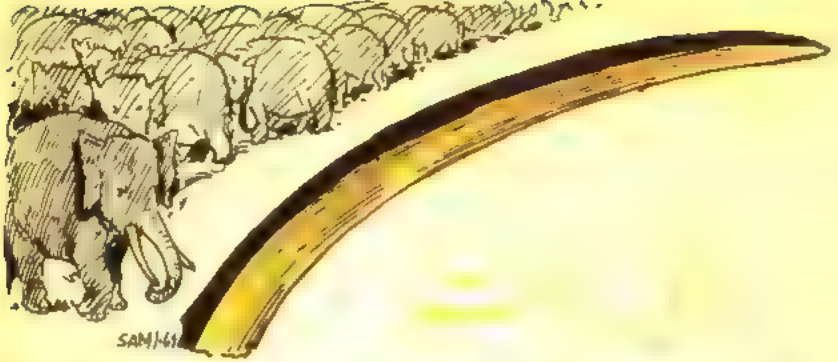
ایک سو پچاس میل لمبی ہاتھیوں کی قطار، جو چالیس ہزار ہاتھیوں پر مشتمل ہو، آپ کے سامنے سے چھے دن اور چھے راتوں میں گزرے گی۔ یہ تعداد ان ہاتھیوں کی ہے، جو ہر سال اپنی موت مرتے ہیں، ان میں بیس فی صد شکار کیے ہوئے ہاتھی شامل ہیں۔ سالانہ ایک ہزار ٹن ہاتھی دانت افریقہ اور ایشیا سے لندن اور اینڈورپ کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ دونوں جگہیں اس چیز کی سب سے بڑی منڈیاں ہیں۔ اصلی ہاتھی دانت ہاتھی کے باہر نکلے ہوئے یا دکھانے کے دانتوں سے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ ہاتھی کی عمر کے لحاظ سے یہ دانت بڑے بھی ہوتے ہیں۔ یہ دانت کئی فیٹ بڑے ہوتے ہیں اور ان کا وزن پندرہ پونڈ سے لے کر دو سو پونڈ تک ہوتا ہے۔ یہ وزن دو دانتوں کا ملا کر ہوتا ہے۔ ہاتھی کے دانتوں کے علاوہ دوسری ہڈیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً دریائی گھوڑے، وھیل مچھلی، جنگلی سور وغیرہ کی یا وہ ہڈیاں، جو قبل تاریخ کے جانوروں سے حاصل کی جاتی ہیں، مگر یہ ہاتھی دانت کے مقابلے میں
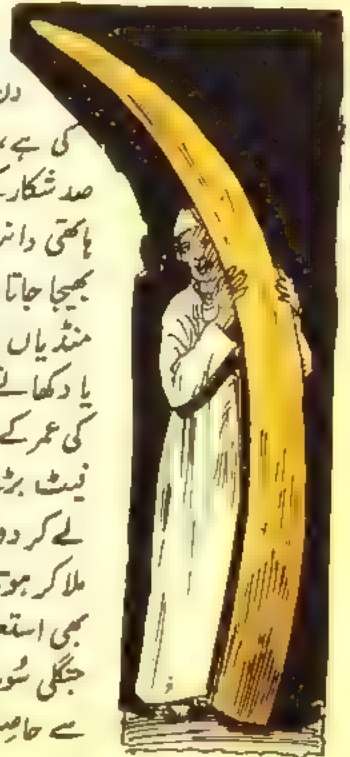
بہت ہی گھٹیا درجے کی ہوتی ہیں۔

ہاتھی دانت کی بہت سی خوب صورت چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ بلیرڈ کی گیند، میز اور کرسیوں اور دوسرے لکڑی کے سامان پر ہاتھی دانت کے ٹکڑوں کا کام کیا جاتا ہے۔ ہاتھی دانت کے قلم، بُندے، بٹن، ہار، مجسّمے اور بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ ہاتھی دانت زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ ہندُستانی ہاتھی کے دانت چھوٹے ہوتے ہیں اور مادہ یعنی ہتھنی کے تو ہوتے ہی نہیں۔ ہاتھی دانت کا بُرادہ پالش کے کام آتا ہے۔ ہاتھی دانت جلاکر کالا رنگ بنایا جاتا ہے۔

شیرِ ببر رنگ اور قد میں عام شیر سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر نو دس فیٹ لمبا اور چار فیٹ اونچا ہوتا ہے۔ شیرِ ببر میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ پنجے کی ایک ہی ضرب سے بھینسے اور گھوڑے جیسے مضبُوط جانور کی کمر توڑ سکتا ہے۔ بَیل کو بڑی آسانی سے اٹھا لے جاتا ہے، لیکن بے ضرورت طاقت کا اظہار نہیں کرتا۔

شیرِ ببر چھوٹے چھوٹے جانوروں کا شکار نہیں کرتا۔ جب تک اسے تنگ نہ کیا جائے یا یہ بھوکا نہ ہو، حملہ نہیں کرتا، ویسے آدمی اس کے پاس سے بھی گزر جائے تو یہ کچھ نہیں کہتا۔ شیرِ ببر زیادہ تر جنوبی، وسطی اور ساحلی افریقہ کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آپس میں مل جُل کر رہتے ہیں اور اکثر پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ کی تعداد میں پھرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس کا شکار بڑا خطرناک کام ہے۔ بندوق کی گولی جب تک اس کے دل و دماغ میں نہ لگے، اس پر قابو پانا محال ہے۔

جب آپ پہلی مرتبہ اس مچھلی کو دیکھیں گے تو یہی سوچیں گے کہ اس مچھلی کے جسم کا آخری حصہ غائب ہے۔ صرف سر ہی سر نظر آرہا ہے۔ آپ خیال کریں گے کہ جب یہ مکمل مچھلی ہوگی تو یقیناً بڑی خوف ناک معلوم ہوتی ہوگی۔

اس مچھلی کے کاندھے کے پاس کا وہ چوڑا حصہ، جہاں سے جسم شروع ہوتا ہے، بالکل نہیں ہے اور گردن کے حصے کے پاس دونوں طرف، یعنی اوپر اور نیچے دو بڑے تکونے پَر ہوتے ہیں اور جہاں سے عام مچھلیوں کا جسم چوڑا ہونا شروع ہوتا ہے، وہاں اس مچھلی کا حصہ ختم ہوجاتا ہے، یعنی یہ مچھلی دھڑ کٹی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا اصلی نام سورج مچھلی (SUN FISH) اس لیے پڑگیا ہے کہ یہ دوپہر کے وقت جب روشنی تیز ہوتی ہے، سمندر کی سطح پر آکر تیرتے ہوئے دھوپ لیتی ہے۔

سورج مچھلی ۸ فیٹ لمبی ہوتی ہے اور اس کا وزن تقریباً ایک ہزار آٹھ سو پونڈ ہوتا ہے۔ یہ مچھلی بڑی چالاک ہوتی ہے اور جو لوگ کشتی میں سوار ہوکر اس کا شکار کرتے ہیں، پہلے تو ان کو بالکل نزدیک آنے دیتی ہے اور پھر بجلی کی سی تیزی سے ایک دم

غوطہ مار کر پانی میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شکار "ہارپون" (HARPOON) (ایک قسم کا وھیل مچھلی مارنے کا آلہ، جس میں ڈوری کے ساتھ لوہے کا تیز تیر لگا رہتا ہے اور جو مشین کے ذریعے شکار پر پھینکا جاتا ہے) سے کیا جاتا ہے۔ جب وہ اس کے لگ جاتا ہے تو یہ کافی اچھل کود کرتی ہے اور اپنے مثلث نما پَروں سے خوب پانی اچھالتی ہے۔ اپنے پکڑنے والے کو دور تک تیزی سے کھینچ کر پانی کی لہروں پر لے جاتی ہے۔ اس کا گوشت کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ صرف تیل کے لیے اس کا شکار کیا جاتا ہے۔

یہ مچھلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قسم کھُردری (ROUGH) کہلاتی ہے۔ دوسری قسم، جو عموماً چوکور ہوتی ہے، کم یاب بھی ہے اور انگلستان اور شمالی افریقہ کے سمندری کناروں میں پائی جاتی ہے۔

ایک ایک لطیفہ

★ داروغہ جیل (قیدی سے)، دیکھو آج تم رہا ہو رہے ہو۔ امید ہے تم نے اپنے لیے کوئی اچھا سا کام سوچ لیا ہو گا۔

قیدی: جی ہاں، میں نے کئی کام سوچ لیے ہیں۔

داروغہ جیل: مثلاً کون کون سے؟

قیدی: ایک سُنار کی دکان، ایک بنک اور چار امیروں کے گھر۔ ارادہ ہے کہ آج رات ہی سے کام شروع کر دوں گا۔

شاہد اختر۔ لاہور

★ باپ (بیٹے سے)، کچھ کام کیا کرو۔ بے کار پھرنا اچھا نہیں۔ جب میں تمھاری عمر کا تھا تو ایک دکان میں بیس رُپے ماہوار پر نوکری کرلی تھی اور پانچ سال کے بعد دکان کا مالک بن گیا تھا۔

بیٹا: آج کل ایسی دھاندلی نہیں چلتی۔ ہر دکان دار اپنا حساب کتاب رکھتا ہے۔

سلیم احمد صدیقی۔ کراچی
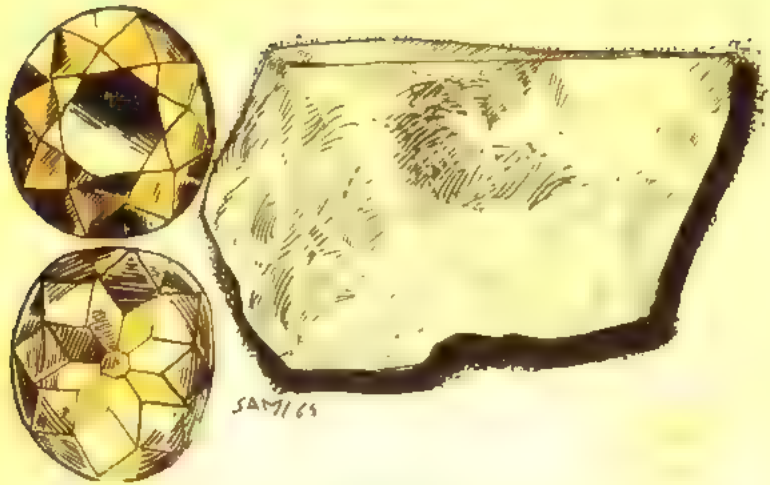
سائنس داں کہتے ہیں کہ ہیرا قلمی کاربن ہے۔ کاربن (CARBON) کیا ہے؟ یہ قدرت کی عطا کی ہوئی بہت ہی معمولی چیز ہے، جو نہ صرف زمین میں پائی جاتی ہے، بلکہ درختوں اور پودوں میں بھی کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ زمین کی تاریخ میں ایک وقت ایسا تھا کہ اس کی گرمی سے کاربن سیال بن گیا اور وزن کے دباؤ سے قلمی بن کر اس کی کالی شکل نہایت ہی خوب صورت پتھر میں تبدیل ہوگئی۔ ہیرے کا رشتہ اس طرح کوئلے سے بالکل قریب کا ہے۔

ہیرا تمام جواہرات میں سب سے خوب صورت اور قیمتی مانا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی دوسری چیز اس سے سخت نہیں ہوتی۔ ہیرا بذات خود سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کی خوب صورتی کی وجہ وہ شعلے کی چمک ہے، جو اس کے اندر تیز نیلے رنگ سے لے کر چمکدار سرخ رنگ کی ہوتی ہے اور ہیرے کے ہر پہلو سے نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ہیرے میں پیلے، گلابی، سُرخ، سبز، نارنجی، نیلے بھورے اور کالے رنگ کی ہلکی سی چمک نظر آتی ہے۔

نیلے، سُرخ اور سبز ہیرے مشکل سے ملتے ہیں اور ان کی قیمت بھی دوسرے ہیروں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ بعض ہلکے رنگ کے نیلے ہیرے اگر سورج کی روشنی کے بعد اندھیرے میں لے جائے جائیں تو فاسفورس کی طرح چمکتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی کانیں ہی سینکڑوں سال سے دنیا کو ہیرے فراہم کرتی رہی ہیں۔ دنیا کے کئی خوب صورت اور مشہور ہیرے ان ہی کانوں سے نکلے ہیں۔ کوہ نور، مغل اعظم، لوف اور ریجنٹ وغیرہ وہ چند ہیرے ہیں، جو برصغیر کی کانوں سے نکلے اور جواہرات کی دنیا میں مشہور ہوئے۔

۳۲۷ سال قبل مسیح جب یونانی پہلی مرتبہ برصغیر سے اپنے ملک واپس گئے تو انھوں نے یورپ والوں کو ہیروں کے متعلق کافی معلومات پہنچائیں۔ افریقہ میں بھی ہیروں کی کانیں پائی گئی ہیں اور ان میں سے بھی کئی مشہور ہیرے نکلے ہیں مثلاً: کیو لینن (CULLINAN) لیسر اسٹار آف ساؤتھ افریقہ (LESSER STAR OF SOUTH AFRICA) وغیرہ۔

ہیرے کی قدر اس لیے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ عام خیال کے مطابق اس کا اثر انسان کی زندگی پر اچھا پڑتا ہے۔ اس کو پاس رکھنے سے انسان کئی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ ہیرے کی سخت دھول جواہرات پر پالش کرنے کے کام آتی ہے۔ اس کی کنی سے شیشہ کاٹا جاتا ہے۔ کان سے نکلنے پر یہ ایک معمولی چمک دار پتھر ہوتا ہے۔ اس کو تراش کر پالش کیا جاتا ہے۔ جب اس کی شکل نکلتی ہے۔ تراش کے بعد ہیرے کے ۵۸ رخ ہوتے ہیں ۳۳ اوپر کی طرف اور ۲۵ نیچے کی طرف، ہیرے کا تقریباً ۶۰ فی صد حصہ تراش اور پالش میں نکل جاتا ہے۔

بجلی کا استعمال اب بہت عام ہوگیا ہے۔ فرشی پنکھے، استری، ہیٹر، ٹیبل لیمپ اور ریڈیو وغیرہ ہر گھر میں موجود ہیں۔ جہاں بجلی کے استعمال سے آسانیاں ہوگئی ہیں، وہاں خطرات بھی ہیں۔ مندرجہ ذیل خاکے نونہالوں کو ان خطروں سے آگاہ کریں گے۔

سمیع آرٹسٹ

ٹوٹا ہوا پلگ اور جگہ جگہ سے کٹی ہوئی ڈوری ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔ ان کو استعمال نہ کرو۔ بدل کر ان کی جگہ نئی چیزیں لگا لینا چاہیے۔
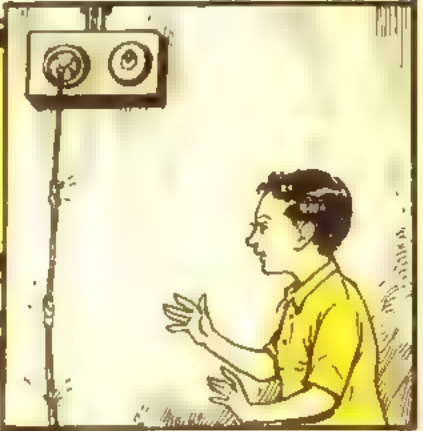
جب بجلی کا فرشی پنکھا چل رہا ہو تو اس کے پاس سے گزرتے وقت اپنے کپڑے سنبھال کر چلو۔

ٹیبل لیمپ ، استری ، پنکھا اور ہیٹر وغیرہ
بجلی سے استعمال ہونے والی یہ تمام
چیزیں جب بجلی ہٹاؤ تو پہلے بٹن بند کردو،
پھر جب ڈوری نکال لو تو اس چیز کو اٹھاؤ۔
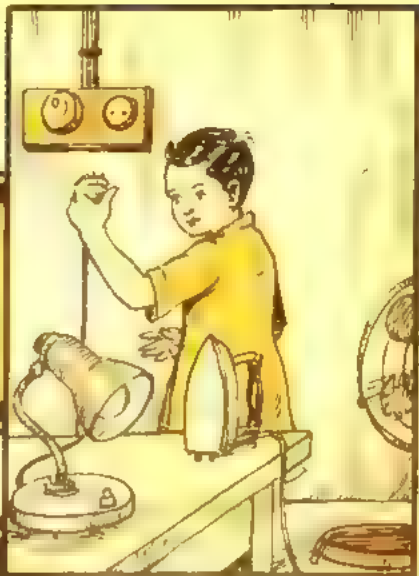
کبھی کبھی سڑک کے کنارے ٹوٹا ہوا تار
ٹوٹ کر لٹک جاتا ہے۔ اُسے ہاتھ
سے نہ پکڑو۔ سخت خطرناک ہوتا ہے۔

ریڈیو یا کسی دوسری استعمال کی چیز میں اگر بجلی کا کرنٹ آتا ہو تو فوراً اس کو بند کرا لو پھر استعمال کرو۔ ایسی چیز ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔
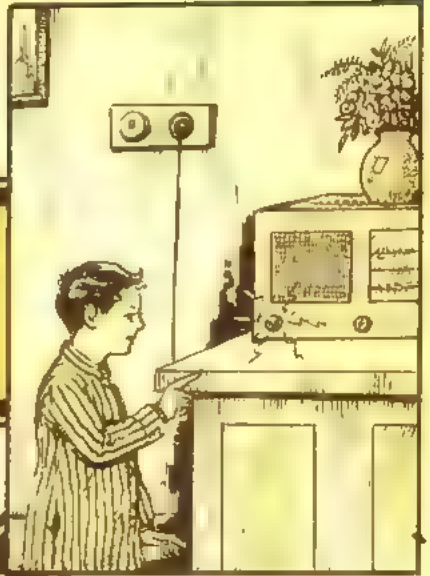
جلے ہوئے بلبوں کے تار کو کبھی ہلا کر جوڑنے کی کوشش نہ کرو۔ نہ اس کو دوبارہ استعمال کرو۔ اس کے پھٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔
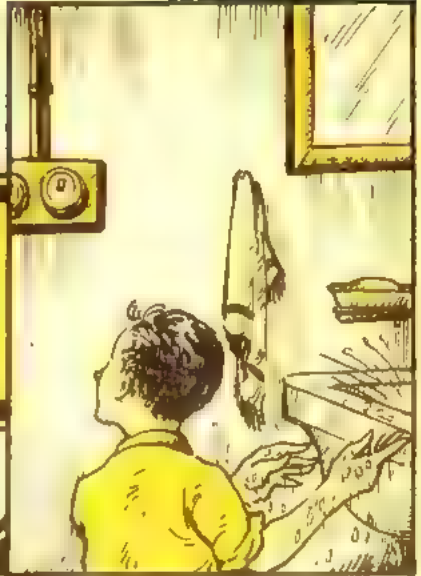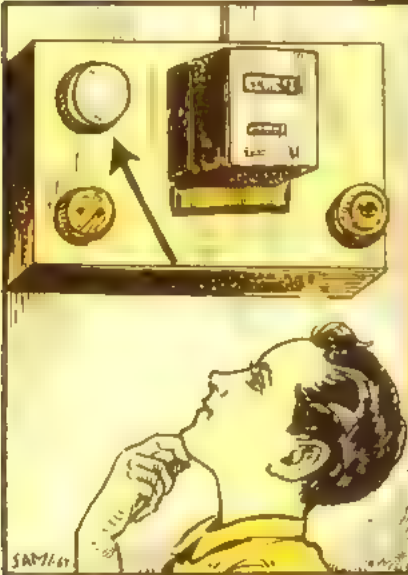
اگر کسی جگہ کٹ آؤٹ (CUT OUT)
کا تار جل جائے تو خود اس کو درست
کرنے کی کوشش نہ کرو۔ کسی ہوشیار
بجلی والے سے اس کو ٹھیک کراؤ۔

ایک بنگلہ کہانی

عشرت رحمانی

چھوٹا بھائی جیت گیا!

افسر ایسا شریر تھا کہ ناٹھور گاؤں کے سارے شریر بچّوں کا سردار مانا جاتا تھا اس کی عمر بارہ برس کی تھی۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ اس کا نام تھا انور۔ وہ بہت نیک اور سیدھا سادہ تھا۔

ایک دن مینہ برس کر تھما تھا۔ کھیت کھیت پانی اور کیچڑ تھا۔ لڑکے بالے اِدھر اُدھر کھیلتے پھر رہے تھے۔ افسر کو بھی شرارت سوجھی۔ وہ اپنے سب ساتھی شریر لڑکوں کو لے کر دریا کے کنارے پہنچا۔ ایک زمانے سے لکڑی کا ایک بڑا سا لٹھا دریا کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ سب نے مل کر اسے دھکیلنا شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ لٹھا دریا میں جا پڑے اور بہتا ہوا چلا جائے۔ اسے بہتا ہوا دیکھ کر سب خوب ہنسیں اور تالیاں بجائیں۔ سب لڑکے اس لٹھے کو دھکیلتے ہوئے لے جا رہے تھے کہ ادھر سے انور بھی وہاں آ پہنچا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ لٹھا دریا میں جا پڑا تو اس کے مالک کا مفت میں نقصان ہوگا۔ اس سے اسے خواہ مخواہ دُکھ ہوگا اور ان لڑکوں کی دل لگی ہو جائے گی۔ اس نے لڑکوں کو منع کیا،

مگر وہ نہ مانے۔ آخر انور اس لٹھے پر بیٹھ گیا، کہ مجھے بیٹھا دیکھ کر یہ سب ہٹ جائیں گے اور مجھے نہیں گرائیں گے۔ لڑکے تو انور کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر چُپ چاپ کھڑے ہو گئے، مگر افسر کو اس پر بہت غصّہ آیا۔ اس نے سوچا کہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی اس حرکت سے اتنے لڑکوں کے سامنے بے عزّت ہونا پڑے گا اور میری سرداری خاک میں مل جائے گی، اس لیے اس نے پہلے تو انور کو ہٹنے کے لیے کہا۔ جب وہ نہ مانا تو اس ضد پر لڑکوں کو زور سے چلّاکر حکم دیا کہ جب میں ایک دو تین کہوں تو لٹھے کو پانی میں پھینک دو۔ چاہے کوئی بیٹھا ہو۔ شریر لڑکوں کو ایک اور تماشا ہاتھ آیا اور وہ افسر کے اس حکم پر ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔

انور یہ سُن کر بھی اطمینان سے لٹھے پر بیٹھا گھانس کے تنکے سے دانت کریدتا رہا۔ جیسے اُس نے کچھ بھی نہیں سُنا اور اتنے میں افسر کی آواز گونجی "ایک۔۔ دو۔۔!" لڑکے تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انور اب بھی چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ افسر نے چلّا کر کہا، "تین" اور لٹھا انور سمیت پانی کے اندر لڑھکتا ہوا جا پڑا۔ لڑکوں نے مل کر اسے اتنی زور سے دھکیلا کہ انور سنبھل بھی نہ سکا اور افسر نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ سب لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ انور کو بے حد غصّہ آیا، مگر بڑے بھائی کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے سارے کپڑے پانی میں بھیگ گئے۔ وہ خاموشی سے غصّے میں لال پیلا ہوا، دریا سے کانپتا ہوا نکلا، اور سیدھا گھر کی طرف چل دیا۔

ان دونوں بھائیوں کا باپ کئی سال ہوئے، فوت ہو چکا تھا۔ ان کی ماں ان کی پرورش کرتی تھی۔ وہ غریب خاندان کے لوگ تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کی گزر بھی مشکل سے ہوتی تھی، اس لیے لکھنا پڑھنا بھی چھوٹ گیا تھا۔ افسر رات دن کھیل کود میں رہتا، مگر انور گھر پر بھی پڑھنے لکھنے کی کوشش کرتا۔

جب انور گھر کی طرف چلا گیا تو افسر نے سوچا اب یہ ماں سے جا کر میری شکایت کرے گا اور مجھے سزا ملے گی، اس لیے وہ بھی اس کے پیچھے گھر چل دیا

اب وہ اپنے دل میں پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ بڑا یا بچّہ کوئی بھی ہو اگر وہ اچھا کام نہیں کرتا یا کسی کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے تو چاہے وہ کتنا ہی بُرا اور شریر کیوں نہ ہو بعد میں بدی سے اس کا ضمیر پچھتاتا ضرور ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس نے جو بُرائی کی وہ نہ کرتا تو اچھا ہوتا۔ کیسا اچھا ہو کہ سب آدمی کام سے پہلے اس کی اچھائی بُرائی سوچ لیں تو انھیں پچھتانا نہ پڑے اور کبھی کسی سے بُرائی نہ کریں۔ اسی طرح افسر بھی یہی سوچتا ہوا جا رہا تھا۔ ادھر انور پہلے ہی گھر بیٹھ کر اپنی ماں کو بتا چکا تھا کہ اس کے بھیّا اور ساتھیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا، اور اس کے سارے کپڑے پانی میں بھگو دیے۔ ماں انور کی نیکیوں اور محنت سے پہلے ہی خوش تھی اور اس کی ہر بات کا اعتبار کرتی۔ ساری باتیں سُنا کر اس نے افسر کو خوب بُرا بھلا کہا اور سزا دی۔ اس کی ماں انور کی زبانی یہ سُن کر اور بھی ناراض تھی کہ افسر نے اپنے شریر ساتھیوں کے ساتھ مل کر کسی شخص کا نقصان کیا۔ اس کا لکڑی کا لٹھا پانی میں بہہ گیا اور اسے اب نہیں مل سکے گا۔ ماں افسر پر خفا ہو رہی تھی کہ ایک شخص وہاں آگیا۔ ماں اسے دیکھ کر "بھیّا، بھیّا" کہہ کے لپٹ گئی۔ یہ شخص افسر اور انور کا ماموں تھا، یعنی ان کی ماں کا بھائی سعید احمد۔ بہت دنوں سے کسی بات پر افسر کے باپ سے سعید احمد کا جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے ان کے گھر آنا جانا بند کر دیا تھا۔ وہ راج شاہی میں رہتا تھا اور تجارت کرتا تھا۔ وہ بہن کی یاد سے بے چین ہو کر ملنے آیا تھا۔ ماں نے بچّوں کو بتایا کہ یہ تمھارے ماموں ہیں۔ انھوں نے سعید احمد کو سلام کیا۔ اس نے دُعائیں دیں اور ان کے لیے جو مٹھائی لایا تھا، وہ نکال کر دی۔ وہ دونوں خوش ہو گئے۔

سعید احمد نے بہن سے پوچھا کہ یہ بچّے کیا پڑھتے ہیں؟ ماں نے بتایا کہ باپ کے مرنے کے بعد ان کو اسکول سے اُٹھا لیا ہے۔ یہ سُن کر اس نے کہا کہ میں دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ وہاں رہیں گے اور اسکول میں پڑھا کریں۔ ماں انور کو بہت چاہتی تھی۔ اُس نے کہا، دونوں

میں سے ایک تو میرے پاس رہے میں اکیلی کیسے رہوں گی اور آخر میں یہ طے پایا کہ افسر ماموں کے ساتھ چلا جائے گا اور انور ماں کے پاس ہی رہے گا۔ افسر کو پہلے تو جانے کے خیال سے دُکھ ہوا مگر جب اس نے سوچا کہ شہر جاؤں گا۔ نئے لڑکوں سے مِلنا جُلنا ہوگا تو وہ خوش ہوگیا۔ دو چار دن رہنے کے بعد سید احمد اپنے گھر راج شاہی جانے لگا۔ افسر بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ انور کو بھائی کے چھوٹنے کا غم ہوا۔ ماں بھی پریشان تھی، مگر یہ سوچ کر اُسے کچھ اطمینان تھا کہ وہ لکھ پڑھ کر لائق ہو جائے گا اور شرارت بھی نہیں کرے گا۔ انور ماں کے پاس رہ کر خود بھی لکھتا پڑھتا رہتا تھا۔

افسر راج شاہی پہنچ گیا اور ماموں کے گھر رہنے لگا۔ ماموں کے دو لڑکے دو لڑکیاں تھیں وہ ان کے ساتھ اسکول جانے لگا اور کھیل کود میں بھی شریک ہوگیا، لیکن تھوڑے دنوں بعد اُس نے دیکھا کہ اس کے ماموں کے لڑکے لڑکیاں اس سے لڑنے جھگڑنے لگے اور اس کی ممانی اپنے بچوں کی وجہ سے اسے خوب ڈانٹنے اور بُرا بھلا کہنے لگی۔ اس کو اپنا گھر یاد آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ممانی کو خوش رکھنے کے لیے ان کی خدمت کرنا چاہیے، مگر اس کی ممانی کسی بات سے خوش نہیں ہوئی۔ وہ اس کے ماموں سے بات بات میں اس کی شکایت کرتی اور اسے روزانہ کسی نہ کسی وجہ سے سزا دِلواتی۔ اب تو افسر بہت ہی دُکھی رہنے لگا اور اُسے اپنا چھوٹا بھائی انور اور ماں یاد آئے، جو اُسے بُرے سلوک پر بھی پیار ہی کرتے تھے، مگر یہاں اس کی ممانی اس کی کسی بات سے خوش نہ ہوتی اور اسے ماموں سے بُرا بھلا کہلوانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور نکالتی رہتی۔

افسر اپنی ساری شرارت بھول گیا اور دن رات اسی سوچ میں رہنے لگا کہ ممانی کو کیسے خوش کرے۔ اس کی بُرائی اور شرارت سب دُور ہوگئی۔ اس نے سوچا اپنے ماں اور بھائی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کسی سے پیار نہیں کرتا اور اپنے غریب گھر میں جو چین آرام ملتا ہے وہ غیر جگہ بادشاہ کے محل میں بھی نہیں مِل سکتا، وہ ممانی کی چغلیوں سے تنگ آگیا۔ اس کے

ماموں زاد بہن بھائی اس کو ستاتے اور اس کی ممانی اُلٹی اسی کی چغلیاں کھاتی کہ وہ اس کے بچوں کو ستاتا اور شرارتیں کرتا ہے۔ اسی سوچ بچار اور پریشانی میں پڑھنے لکھنے میں بھی اس کا دل نہ لگتا۔ اس لیے اسکول میں اُستاد بھی اُسے ڈانٹتے اور اس کے ماموں کو شکایت لکھ کر بھیجتے۔ اس کا ماموں اسے روز ڈانٹتا کہ تم گھر میں شرارت کرتے ہو اور اسکول میں بھی کھیل کود میں رہتے ہو۔

ایک دن اُسے سبق یاد نہ تھا۔ اُستاد نے اُسے سزا دی۔ ادھر اس کی کتاب کھو گئی۔ سب لڑکوں نے بھی اسے چھیڑا۔ وہ کھسیانا اور پریشان ہو کر ممانی کے پاس گیا اور انھیں بتایا کہ میری کتاب کھو گئی ہے۔ ممانی نے اسے اور بھی ڈانٹا کہ تو نے جان کے پڑھنے سے بچنے کے لیے کتاب کھو دی۔ جا ابھی ڈھونڈھ کے لا۔ ہم اپنے بچوں پر خرچ کریں یا تیری کتابیں بار بار خریدیں۔ افسر ڈرا سہما گھر سے نکلا اور کتاب ڈھونڈھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں ڈھونڈھے۔ وہ راستے میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ بارش کا طوفان آگیا۔ وہ بہت بھیگ گیا۔ اب ڈر کے مارے گھر آنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ممانی کتاب کو پوچھے گی تو کیا جواب دے گا۔ ادھر بارش موسلادھار برس رہی تھی اور وہ تھر تھر کانپتا روتا چلا جا رہا تھا۔ آخر میں وہ راستے میں کیچڑ میں پھنس کر پھسل گیا اور گر پڑا۔ اسے چوٹ [illegible] بھیگنے سے بخار آگیا۔ گرتا پڑتا گھر آیا اور بیہوش ہو کر پلنگ پر پڑ گیا اس کے ماموں نے دیکھا کہ اس کا بدن بخار سے پھنک رہا ہے۔ بارش تھم گئی تو ماموں نے ڈاکٹر کو بلا کر اُسے دکھایا اور اس کی ماں کو بلانے کے لیے آدمی بھی بھیج دیا۔ کیوں کہ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے نمونیہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ دوسرے دن ماں گھبرائی ہوئی آئی۔ افسر بخار میں بیہوش پڑا تھا اور ہذیان بک رہا تھا۔ وہ برابر چلاّ رہا تھا، "امّی، مجھے معاف کر دو، اب میں شرارت نہیں کروں گا، انور کو نہیں ستاؤں گا، مجھے گھر بلالو۔" ماں اور انور اسے پیار کرتے اور روتے رہے۔ ماموں کو بھی اس کی بیماری سے سخت پریشانی تھی اور ممانی بھی اب پچھتاتی تھی کہ اس نے

اتنی سختی کیوں کی۔ ڈاکٹر کے علاج سے اُسے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر اس کے ماموں نے گھبرا کر ایک حکیم صاحب کو بُلا لیا۔ وہ بوڑھے تجربے کار آدمی تھے۔ انھوں نے افسر کو بڑے پیار سے دوا پلائی اور سب گھر والوں سے کہا کہ اس کو پیار سے تسلّی دیں، اسے بیچ سے سردی لگی ہے، اسی سے بخار ہوا ہے، مگر اس کے دل میں کوئی ایسا خوف ہے، جو اس کے دماغ کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ سب نے تسلّی دلاسہ دیا۔ آخر کئی روز بعد اس کا بخار کم ہوا اور ہذیان بھی دور ہو گیا۔ وہ ہوش میں آتے ہی انور کو گلے لگا کر رونے لگا اور کہنے لگا، "میرے ننھے بھیّا مجھے معاف کر دے۔ میں اب تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔" انور نے بڑے بھائی کو پیار کیا، ماں نے اسے دلاسہ دیا اور ماموں ممانی نے بھی پیار تسلّی سے اسے سب کچھ بھول جانے کو کہا۔ خدا خدا کر کے اس کا بخار ٹوٹا اور وہ اچھا ہونے لگا۔

اب اس نے توبہ کی کہ کبھی شرارت نہیں کرے گا اور بُرے بچّوں کے ساتھ نہیں کھیلے گا۔ اس کے تندرست ہونے سے ماں، انور اور ماموں، ممانی سب ہی خوش تھے۔ تن درستی کے بعد افسر سچ مچ نیک اور اچھا لڑکا بن گیا اور خوب محنت سے لکھنے پڑھنے لگا۔ ماموں ممانی نے بہت کہہ سُن کر اس کی ماں کو بھی اب راج شاہی میں رہنے پر آمادہ کر لیا اور انور بھی وہیں اسکول میں داخل ہو کر پڑھنے لگا۔ افسر کے سنبھل جانے سے سب کچھ ٹھیک ہو گیا اور سب خوشی خوشی آرام سے رہنے لگے۔ اس کی ماں محنت مزدوری کرتی اور سب چین سے رل کر رہتے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوشیاں ہماری نیکی اور اچھائی کا انعام ہیں اور دُکھ، بُرائی کا بدلہ۔

لطیفے

حسن مرتضیٰ۔ کراچی

ملاح: (کپتان سے) حضور پانی خطرے کے نشانات کو پار کر گیا ہے۔
کپتان: خطرے کے نشان کو اور اوپر کر دو۔

راہ گیر: (فقیر سے) بابا۔ کیا واقعی تم بہرے ہو۔
فقیر: ہاں بابو قسم لے لو جو مجھے ایک لفظ بھی سنائی دیا ہو۔

ماں کی دُعا

فہمیدہ اختر

کسی زمانے میں ایک شہر میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ اس کی عمر ابھی سات آٹھ برس کی ہی تھی کہ اس کے دماغ میں یہ گھمنڈ سما گیا کہ وہ سب سے بڑی ہے۔ وہ چھوٹے بچوں کو مارتی ستاتی۔ وہ روتے تو خوش ہوتی۔ جانوروں پر بھی ظلم کر کے ہنستی۔ ایک پیاری سی بلی کی دُم کھینچ کر اُسے بڑا ہی مزا آتا۔ اس لڑکی کی ماں اُسے سمجھاتی کہ ایسی باتیں بُری ہوتی ہیں۔ سب کے ساتھ بھلائی اور پیار کا برتاؤ کرنا اچھا ہوتا ہے، مگر لڑکی اپنی ماں کا کہنا نہ مانتی۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس لڑکی کا باپ بیماری سے مر گیا اور اب اُس کی ماں اور وہ بہت سے زیادہ غریب ہو گئیں، لیکن لڑکی کا گھمنڈ اور دوسروں کو ستانے کی عادت نہ گئی۔ اس لڑکی کا نام گھمنڈی مشہور ہو گیا۔

ایک دن یہ گھمنڈی لڑکی اپنی ایک سہیلی کے گھر گئی۔ سہیلی نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اچھے اچھے کھانے کھلائے۔ اس کے پھٹے پُرانے کپڑے اُتروائے۔ خوشنما کپڑے پہنائے۔ گھمنڈی لڑکی سہیلی کے گھر کئی دن مہمان رہی۔ وہاں بھی وہ جانوروں کو ستاتی رہتی۔ اچھے کپڑے پہن کر وہ اور بھی زیادہ اترانے لگی۔

گھمنڈی کے دل میں اپنی ماں کا پیار بھی نہ تھا۔ کئی دن بعد اس کی سہیلی نے کہا کہ "بہن تمھاری ماں تمھیں یاد کرتی ہوں گی۔ ان سے جاکے مل آؤ۔" وہ یہ سُن کر سوچنے لگی۔ پھر گھر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اصل میں گھمنڈی کو ماں تو ذرا بھی یاد نہ آتی تھی۔ وہ تو اس لیے جانا چاہتی تھی کہ اس نے خوب صورت کپڑے پہنے ہیں۔ یہ اپنی ماں اور ہمسائے کی لڑکیوں کو دکھائے گی۔ اور اترائے گی۔

گھمنڈی اپنے گھر سے ذرا دُور پہنچی تھی کہ راستے میں اُس نے دیکھا، اس کی ماں بیچاری ایک جگہ بیٹھی ہانپ رہی ہے اور اُس کے سامنے لکڑیوں کا گٹھا رکھا ہے۔ یہ لکڑیاں وہ جنگل سے چُن کر لا رہی تھی کہ بیچ کر کھانے پینے کے لیے کچھ پیسے مل جائیں۔ بوجھ اُٹھا کر چلتے چلتے تھک گئی اور سستانے کو بیٹھ گئی۔ گھمنڈی لڑکی نے جو اپنی ماں کو اس بُرے حال میں دیکھا تو اسے بڑی شرم آئی کہ اُس کو ماں کہہ کر پکارے اور اس سے ملے بغیر جلدی سے منھ پھیر کر اپنی امیر سہیلی کے گھر واپس چلی گئی۔

سہیلی نے سمجھا کہ وہ ماں سے مل آئی ہے۔ گھمنڈی سہیلی کے پاس رہنے لگی۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہنتی اور مزے دار کھانے کھاتی۔ اس کی سہیلی اسے خوش کرنے کو کہتی کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ یہ سُن کر وہ اور بھی اتراتی۔ غرض اس کا گھمنڈ بڑھتا ہی گیا۔

اس نے اپنی سہیلی سے جھوٹ موٹ بہانہ کردیا کہ اس کی ماں کسی رشتے دار کے گھر مہمان گئی ہے اور وہاں سے بہت دنوں بعد گھر لوٹے گی۔

اسی طرح پانچ چھے مہینے گزر گئے۔ اس کی سہیلی نے پھر ایک دن اس سے کہا کہ "بہن تم کسی دن اب اپنی امی سے مل آؤ اور اُن کے لیے کچھ ساتھ بھی لے جاؤ۔" اور نوکر سے کہہ کر خوب مزے دار حلوہ اور پوریاں پکوا کر اس کے ساتھ کر دیں۔

گھمنڈی لڑکی چمکدار کپڑے پہن اور حلوہ پوری ساتھ لے کر اتراتی ہوئی ماں کے پاس روانہ ہوئی۔ کچھ دیر پہلے خوب زور کی بارش ہو چکی تھی۔ چلتے چلتے جب گھمنڈی اپنے گھر کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ راستہ میں کیچڑ اور پانی بھرا پڑا ہے۔ گھمنڈی کو فکر ہوئی کہ اس کے خوشنما کپڑے اور جوتیاں خراب ہوجائیں گی۔ یہ سوچ کر اُس نے کیا کیا کہ

پوریاں ایک ایک کر کے کیچڑ میں اس طرح ڈالنی شروع کیں کہ اس کے جانے کو صاف راستہ بن جائے اور پھر وہ آہستہ آہستہ ایک ایک پوری پر پاؤں رکھ کر چلنے لگی۔ مگر ابھی وہ راستہ طے نہ کرنے پائی تھی کہ ایک جگہ جُوں ہی اُس نے پاؤں رکھا گیلی زمین اندر دھنسنے لگی اور گھمنڈی لڑکی کمر تک اُس کے اندر پھنس کے رہ گئی۔ اس نے باہر نکلنے کی جتنی کوشش کی اُتنا ہی اندر دھنستی چلی گئی۔ اب تو وہ بہت گھبرائی۔ اُسے کیچڑ بھری زمین پر سخت غصّہ آرہا تھا اور سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہے سامنے سے ایک بوڑھا آرہا ہے۔ بوڑھے نے قریب آکر غصّے سے گھورا اور چلّا کر کہا،

"اے گھمنڈی لڑکی! اب تُو اس دلدل میں سدا پھنسی رہے گی۔ تیرے گھمنڈ اور بُرائی کا یہی انجام ہے۔ تو نے رزق پر پاؤں رکھا۔ خدا کی دی ہوئی نعمت کو اس طرح ٹھکرایا۔ اگر یہاں سے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی تو پتھر کی مورتی بن جائے گی۔ یاد رکھ!" لڑکی مارے ڈر کے کانپنے لگی اور اس نے گھبرا کر زور کیا کہ جلدی جلدی دلدل سے نکل کر بھاگے، مگر جُوں ہی اُس نے قدم اُٹھانے کا ارادہ کیا اُسے معلوم ہوا کہ اُس میں ذرا سی بھی قوت نہیں۔ وہ ہاتھ بھی نہیں ہلا سکی۔ بوڑھے کی بد دعا سے وہ پتھر کی مورتی بن چکی تھی اور بوڑھا آدمی وہاں غائب ہو چکا تھا۔ اب اس میں سوچنے سمجھنے کی قوت بھی نہ تھی۔

اَدھر سے اس کے ہمسا[illegible] لڑکی جا رہی تھی، اس کی نظر [illegible]ڈی لڑکی پر پڑی۔ وہ سمجھی یہ کیچڑ میں دھنس گئی ہے اور جلدی سے بھاگ کر اس نے گھمنڈی کی ماں کو اس کی خبر کی۔ ماں بیچاری روتی پیٹتی [illegible] آئی۔ دیکھتی کیا ہے کہ بیٹی دلدل م[illegible] کی مورتی بنی کھڑی ہے۔ ماں کا رو[illegible] روتے بُرا حال ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا اور رو رو کر دعا مانگنے لگی کہ "خداوندا! میری بچّی کی خطا معاف کر۔ تو بڑا رحیم اور کریم ہے۔ اس نے ناسمجھی سے تیری نافرمانی کی ہے۔ تیرے [illegible] بے ادبی کی ہے۔ میرے مالک، تو بخش دے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ مجھ عاجز غریب بندی کی دُعا قبول کر لے۔"

گھمنڈی کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ آنسو کا ایک قطرہ گھمنڈی

کے سر پر جا پڑا۔ اس آنسو کی برکت سے گھمنڈی پتھر کی مورتی سے پھر لڑکی بن گئی۔ اللہ پاک نے ماں کی دعا قبول کی۔ اور اس کے آنسوؤں پر رحم فرمایا۔
گھمنڈی میں دلدل سے نکلنے کی طاقت [illegible] آگئی۔ جب وہ دَوڑتی ہوئی ماں کے [illegible] تو ماں نے اُسے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔
اب گھمنڈی کا سب گھمنڈ دُور ہوگیا [illegible] تھا۔ وہ رو کر ماں کے قدموں سے لپٹ گئی اور معافی مانگنے لگی۔ "امّی میں اب کبھی ایسی خطا نہیں کروں گی۔ مجھے معاف کر دو"
ماں نے خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دُعا دی "میری بچی اللہ پاک تجھے سدا خوش رکھے اور نیک بنائے"
اور ماں کی دعا نے گھمنڈی کو ایک نیک اور اچھی لڑکی بنا دیا۔

لطیفے

[illegible] : (اندر داخل ہوکر) حضور بادل آگئے ہیں!
مالک : تو انھیں کہو، ابھی ٹھہریں بیٹھک ابھی صاف نہیں ہے!

اُستاد : (نئے طالب علم سے) تمھارا نام کیا ہے؟
طالب علم: ہنری اِسمتھ!
اُستاد : بیٹا تمھیں استاد سے بات کرنے سے پہلے "سر" کہنا چاہیے۔ اب بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟
طالب علم: "سر" ہنری اسمتھ!

استاد : (شاگرد سے) اپنے آرٹ کاغذ پر ایک طوطا اور اس کا پنجرا بناؤ اور پنجرے کے دروازے کو کھلا رکھنا۔
تھوڑی دیر بعد اُستاد شاگرد کے پاس آئے اور کہا،
اُستاد : (شاگرد سے) کیوں طوطا کہاں بنایا ہے؟"
شاگرد : دروازہ کھلا تھا اس لیے اُڑ گیا۔

(صہیب احمد صدیقی لاہور)

جانوروں کی کہانیاں

بہادر خرگوش

کسی جنگل میں ایک خرگوش رہتا تھا۔ جب سے پیدا ہوا تھا اس وقت سے لے کر اس واقعہ تک وہ بہت ہی ڈرپوک تھا۔ اتنا ڈرپوک کہ اگر کوئی پرندہ اپنے پر ہلاتا یا درخت سے پتہ گرتا تو اس کا کلیجہ خوف سے کو آجاتا۔ آخر اس بزدلی کی زندگی سے وہ تنگ آگیا۔ وہ بہت سوچتا کہ اس خوف کا کیا علاج کرے، مگر سمجھ میں نہ آتا۔

آخر ایک دن اچانک نہ جانے کیا ہوا ایک پہاڑی پر چڑھ کر چلا چلا کر کہنے لگا، "میں کسی سے نہیں ڈرتا، میں بہت بہادر ہوں، سن لو جنگل والو مجھے کسی کا خوف نہیں۔"

یہ شور سن کر جنگل کے تمام بڑے بوڑھے بچے۔ نوجوان، جانور اور سارے خر۔ اکھٹے ہو گئے۔ جب انھوں نے خرگوش کی یہ باتیں سنیں تو انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ لگے ایک دوسرے سے سوال کرنے،

"یہ ایک دم اس خرگوش کو کیا ہوا؟"

"ارے بھئی کیا ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے۔" ایک نے کہا۔

"خواب تو نہیں مگر اس خرگوش کا دماغ خراب ہو گیا ہے بڑا آیا کسی سے نہ ڈرنے والا آج تک کوئی ایسا خرگوش پیدا نہیں ہوا جو کسی سے نہ ڈرتا ہو۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"کیا تم بھیڑیے سے بھی نہیں ڈرتے؟"

ایک جانور نے اس خرگوش سے پُوچھا :-

" بھیڑیا کس بزدل چیز کا نام ہے، میں کسی سے نہیں ڈرتا "

" سبحان اللہ - اِس کا واقعی دماغ خراب ہوگیا ہے " سب خرگوش اُسے پاگل سمجھ کر اُس [illegible] قہقہے لگانے لگے ، بچے ، بوڑھے سب [illegible] کی حماقت پر ہنس رہے تھے . مگر وہ [illegible] ان کر تیس مار خاں کی طرح کہہ رہا تھا

" بے وقوف تم ہو بزدلو ، میں بہادر ہوں بہادر - جانباز ، سرفروش ، اب میں بزدل خرگوش نہیں ہوں "

جوں ہی یہ باتیں ہورہی تھیں ، دوسری طرف سے بھیڑیا بھی شکار کی تلاش میں اُدھر آنکلا - دن بھر کا بھوکا تھا . اُس نے نوجوان خرگوش کو دیکھا ، جو اکڑ اکڑ کر کہہ رہا تھا " میں بھیڑیے کے باپ سے بھی نہیں ڈرتا " اس نے دل میں سوچا " آج خوب مزے دار دعوت ہوگئی " دبے پاؤں ایک طرف درخت کے پیچھے کھڑا ہوگیا ، اور اُس کی اور اُس کے ساتھیوں کی باتیں سُننے لگا . کسی خرگوش نے بھی ابھی تک اُسے نہ دیکھا تھا -

بہادر خرگوش کی شیخی کی باتیں اور اُس کے ساتھیوں کا مذاق اڑانا ایک ایسا دلچسپ سماں تھا کہ بھیڑیا بھی تھوڑی دیر درخت کے نیچے کھڑا یہ سب تماشا دیکھتا رہا . بہادر خرگوش ایک قریب کے درخت کی ٹہنی پر چڑھ کر کہنے لگا ،

" دیکھو . میری طرف دیکھو بزدلو اور سنو اب میں کیا کرنے لگا ہوں ، میں تمھیں ایسی چیز دکھانے لگا ہوں جو تم نے کبھی پہلے نہ سُنی ہوگی نہ دیکھی ہوگی - میں . . . . . میں . . . . . میں . . . " لیکن وہ دوسرا لفظ نہ بول سکا ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے بہادر خرگوش اپنی زبان نگل گیا ہے " کیوں کہ بہادر خرگوش نے بھیڑیے کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ لیا تھا - اس کا سانس رُک گیا - وہ اتنا ڈر گیا کہ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا - دوسرے خرگوشوں نے ابھی بھیڑیے کو نہیں دیکھا تھا -

اب عجیب ہی تماشا ہوا - بھیڑیا درخت کی اوٹ سے نکل کر سب کے سامنے آگیا - بہادر خرگوش اِتنا ڈر گیا کہ وہ بے ہوش ہونے لگا - جیسے اُس کا دماغ شل ہوگیا ہو ، آخر بدحواس ہوکر ٹہنی سے نیچے گیند کی طرح گرا . اتفاق سے وہ سیدھا بھیڑیے کے اوپر آپڑا - بھیڑیے نے سمجھا شاید کسی شکاری نے اس پر فائر کردیا ہے - اُسے جان کے لالے پڑگئے - تیزی سے بھاگتا ہوا کوسوں دور چلاگیا اور پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا -

ادھر بہادر خرگوش دوسری طرف بھاگتا جا رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ بھیڑیا اس کے بالکل قریب پیچھے آرہا ہے۔

بہادر خرگوش تھک کر چور ہو گیا اور ایک جھاڑی میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ ابھی بھیڑیا مجھے کھا لے گا۔ بہت دیر بعد بھیڑیے کو ہوش آیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کوئی خرگوش جھاڑیوں کے پیچھے، کوئی سوراخ میں اور کوئی مٹی کے ڈھیر کے پیچھے خاموش چھپا بیٹھا ہے۔

سب خرگوش چھپے چھپے بیٹھے تھک گئے۔ اُن میں سے جو بہادر تھے ایک ایک کر کے باہر نکلے اس طرح سے سب باہر آ گئے اور اکڑ کر کہنے لگے۔

"واقعی وہ بہت بہادر ہے، خوب بہت خوب۔ کیا ہی عجیب و غریب کرتب دکھایا اُس نے اگر وہ نہ ہوتا تو ہم سب کی آت مر جاتے۔ بھیڑیا سب کو ہڑپ کر جاتا۔ اب وہ کہاں ہے۔" تمام خرگوش اُس کو تلاش کرنے لگے، مگر اُس کا کہیں نشان نہ ملتا تھا۔ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کوئی کہے کہ اُسے کوئی دوسرا بھیڑیا کھا گیا ہے۔

آخر انھوں نے اُسے ایک جھاڑی کے پیچھے غشی کی حالت میں پایا اور اُسے جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا، "کمال کر دیا تم نے تو۔ تم واقعی بہادر ہو، ہم تو سمجھے تھے کہ تم کہیں بھاگ رہے ہو۔"

یہ سن کر بہادر خرگوش نے حوصلہ کیا اور اکڑ کر کہنے لگا: "ارے بزدلو میں شیخی نہیں مارتا تھا۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔"

اور اُس دن کے بعد سے بہادر خرگوش کو یقین ہو گیا کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ ساری دنیا اس کے مقابلے میں بزدل ہے، لیکن حال بھی یہی ہے کہ پتہ گرے تو وہ ایک دفعہ [illegible] جاتا ہے۔

اقوال زریں

★ — لوگوں سے نا امید رہنا ان کے سامنے عاجزی کرنے سے بہتر ہے۔

★ — عالم جاہل کو اس لیے پہچانتا ہے کہ وہ خود جاہل رہ چکا ہے، مگر جاہل شخص عالم کو نہیں پہچانتا۔ اس لیے کہ وہ خود عالم نہیں رہا۔

★ — جاہلوں کی بات پر تحمل کرنا عقل کی زکوٰۃ دینا ہے

★ — حکومت، دولت اور مصیبت میں انسان کی عقل کا امتحان ہو جاتا ہے۔

★ — عقل مند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔ نہ یہ کہ دوسروں کے لیے عبرت کا باعث بنے۔ (حضرت علیؓ)

بندر کی شرارت

توقیر

بندر کی شرارت اور چالاکی کے قصے تو شاید تم میں سے اکثر نے سُنے ہوں گے۔ یہ جتنا عیار مکار جانور ہے، اتنا ہی عقل مند اور شریر بھی ہے۔ نقالی میں تو یہ کمال رکھتا ہے۔ جو کام کسی کو کرتے دیکھے جھٹ وہی کرنے لگتا ہے۔ بندر والا بندر بندریا کو لیے ان کا تماشا شہروں، قصبوں میں جگہ جگہ دکھاتا پھرتا ہے اور تماشے میں جو عجیب اور مزے دار شرارتیں یہ بندر بندریا کو سکھاتا ہے، اس سے زیادہ دونوں اپنی عادت اور عقل کے زور سے نئی نئی دل چسپ حرکتیں کر کے بچوں اور بڑوں سب ہی کو اپنے کھیل کرتب سے ہنساتے ہیں۔

بندر ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں میاں بندر اپنی کسی نہ کسی قسم کے ساتھ موجود نہ ہوں۔ ہندستان کے کئی علاقوں میں ان کی آبادی بہت زیادہ ہے بنگال میں بھی بہت ہیں۔

کسی گاؤں میں ایک میلہ تھا۔ وہاں ایک ایک بندر والا بندر نچانے آیا۔ "ڈگ ڈگ" اس کی ڈگڈگی کی آواز میلے میں چاروں طرف گونجنے لگی۔ لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہونے لگے۔ بچے اپنے ابا یا اماں کی اُنگلی پکڑے ہنستے خوش ہوتے دوڑے دوڑے آئے کہ خوب مزا ہوگا اب بندر کا تماشہ دیکھیں گے۔ بندر والے کے پاس

معمول کے مطابق ایک بندر اور ایک بندریا تھی۔ بندر لال پیلی لمبی اونچی سی تاج نما ٹوپی اوڑھے تھا اور بندریا لال چُنریا اوڑھے تھی۔ دونوں نے مل کر خوب کھیل تماشے دکھائے۔ کبھی بندر ڈنڈا لے کر بندریا پر رعب جمانے لگتا کہ اتنی دیر سے روٹی کیوں نہیں پکائی، مجھے بھوک لگی ہے، بندریا خفا ہو کر الگ بیٹھ جاتی اور اپنے میکے چلے جانے کی دھمکی دے کر روٹھ کر چلنے لگتی، پھر بندر اس کو منانے کے لیے بڑے مزے کی حرکتیں کرتا اور آخر خوشامد کر کے راضی کر لیتا۔ بندریا خوشی خوشی روٹے پکانے بیٹھ جاتی۔ غرض جو کچھ بندر والا ان کی کہانی اپنی زبان سے سُناتا جاتا وہ سب کچھ اپنی حرکتوں سے کر کے تماشہ دکھلاتے جاتے۔ جیسے خاموش فلم ہیں۔ خیر تو جب یہ تماشا ختم ہو گیا اُس وقت بندر والے نے بندر بندریا سے کہا "اب ان سب بھائی بہنوں مائی باپوں سے اپنے اور میرے کھانے کو پیسے مانگ لاؤ"۔ وہ ایک ایک کے سامنے جا کر مزے سے ہاتھ پھیلا کر پیسے مانگنے لگے۔ کسی نے ایک آنہ دیا، کسی نے ایک پیسہ، کسی نے دو پیسے۔ تھوڑی دیر میں پیسوں اور آنوں کا ڈھیر لگ گیا۔ میلے میں اتنے لوگ جمع تھے، ان میں سے بہت سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ بندر والے کو اچھی خاصی آمدنی ہوئی۔ وہ اپنے بندر بندریا کو خوشی خوشی لیے ہوئے ایک ڈنڈے میں اپنا جھولا کاندھے پر لٹکائے ڈگڈگی بجاتا قریب ہی درختوں کے جھنڈ میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے اپنا جھولا زمین پر رکھا، بندر بندریا کو ایک طرف بٹھایا اور جھولے میں سے روٹی نکال کر اس میں گھی اور شکر ملا کر مزے دار ملیدہ بنایا۔

ہاں ایک بات تو بتانا رہ گئی۔ بندر والے کے ساتھ ایک بکرا بھی تھا۔ یہ بکرا بھی خوب کھیل تماشے اور ناچ دکھاتا تھا۔ بندر والے نے بکرے کو ایک طرف چھوڑ دیا کہ وہاں درختوں کے سائے میں گھاس چرتا پھرے گا۔ ملیدہ جھولے میں رکھ کر اب وہ پاس کے تالاب میں نہانے چلا گیا تاکہ تازہ دم ہو کر آئے اور آرام سے ملیدہ کھائے۔

بندر والے کے جانے کے بعد بندر بندریا نے آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کا مطلب سمجھ گئے اور صلاح کر کے جلدی جلدی جھولے میں سے ملیدہ نکال دونوں نے خوب پیٹ بھر کے کھایا اور بندر نے تھوڑا سا

ملیدہ چپکے سے بکرے کے منھ پر مل دیا اور دونوں چپ چاپ جاکر وہیں بیٹھ گئے۔ جہاں مالک نے بٹھایا تھا، جیسے انھیں بیچارے کو کسی بات کی خبر ہی نہیں۔

وہیں تھوڑی دور کچھ لوگ بیٹھے آرام کر رہے تھے، انھوں نے بندر بندریا کی یہ چالاکی اور مکاری دیکھی، اور آپس میں خوب ہنستے رہے۔ اتنی دیر میں بندر والا بھی آگیا، اُس نے جھولا اُٹھایا اور ملیدے کا برتن نکال کر کھانے بیٹھا، مگر وہاں کیا تھا۔ برتن صفا چٹ ۔ اس نے سمجھا کہ بندر بندریا نے کھایا ہے۔ وہ غصے میں اُٹھا کہ ان کی خبر لے کہ سامنے سے بکرا بیچارہ جو سیدھا سادا جانور ہے گھاس چرتا آرہا تھا اور اُس کے منھ کو ملیدہ لگا ہوا تھا۔ بس اب کیا تھا بندر والے کو ایسا تاؤ آیا کہ اُس نے اپنا ڈنڈا اُٹھا بکرے کو دُھننا شروع کر دیا۔ بندر بندریا دونوں سہمے ہوئے بیٹھے تھے، بلکہ اس درمیان میں دونوں نے چپکے سے اُس طرف سے منھ پھیر لیا جیسے ان کو اس قصے کا کچھ بھی پتہ تک نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بکرا بے گناہ مار کھاتا رہا، مگر کیا کرتا۔ بیچارہ بے زبان مالک کو کیسے بتائے کہ چور تو مزے سے بیٹھے ہیں اور میں نے مفت میں مار کھائی۔ وہ میں میں کرتا رہا اور پٹتا رہا۔

جو لوگ یہ تماشا دیکھ چکے تھے اُنھوں نے آکر بکرے کو بچایا اور بندر والے کو جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے سارا حال سُنایا۔ اس طرح بکرے غریب کی جان مصیبت سے چھوٹی۔ ورنہ وہی مثل تھی کہ "بندر کی بلا بکرے کے سر"۔

اب بندر والے نے ان دونوں کی خوب خبر لی اور ان کی مکاری اور چالاکی کا مزا ڈنڈوں سے چکھایا۔ یوں اپنے کیے کی سزا دونوں کو مل گئی۔

یہ واقعہ سُن کر بچپن کی شرارتیں یاد آجاتی ہیں کہ بعض اوقات کچھ شریر بچے بھی اس طرح کی شرارت کریا کرتے ہیں۔ شاید اس بندر نے بھی کسی لڑکے کو کبھی ایسی دل لگی کرتے دیکھ لیا ہو اور وہ اسے یاد ہو جس کی نقل کر کے اُس نے اور بندریا نے ملیدہ اُڑایا اور بکرے کے سر قصور تھوپا۔ لیکن اصل قصور کی سزا سے خود بھی نہ بچ سکے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

پیارے بچو! ہنسی دل لگی میں بچپن کی معصوم شرارتیں کرنا تو کوئی ایسی بات نہیں بس یہ یاد رکھو کہ کبھی کوئی شرارت ایسی نہیں کرنا چاہیے جس سے کسی دوسرے کو دُکھ اور نقصان پہنچے، ورنہ پھر حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

چھوٹا بیٹا، چھوٹا گھوڑا اور شاہ زادی

علی اسد

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک غریب کسان رہا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے کا نام تھا دانیال۔ اس سے چھوٹے کا نام تھا جلال اور سب سے چھوٹے کا نام تھا، کامران۔ دانیال اور جلال تو بڑے ہوشیار اور محنتی تھے، مگر کامران بے حد کاہل تھا۔ وہ دن دن بھر آرام سے ٹانگیں پھیلائے خیالات میں کھویا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے لوگ اُسے بے وقوف سمجھا کرتے تھے۔

ایک دن کسان جب صبح کو اپنے کھیت پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے گھاس کے گٹھوں میں کچھ کمی نظر آ رہی ہے۔ اس نے فوراً اپنے بڑے بیٹے کو بلایا اور کہا، "دانیال، کوئی شخص ہماری گھاس چُرا رہا ہے۔ آج رات تم کھیت پر چوکیداری کرو اور چور کو پکڑ لو۔" یہ سُن کر دانیال بولا، "نا بابا، یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو مجھ سے جاگا نہ جائے گا۔"
کسان یہ جواب سُن کر اپنے دوسرے بیٹے جلال سے مخاطب ہوا اور اس سے کہا کہ وہ رات کو چوکیداری کرلے۔ جلال بولا، "یہ کام تو کامران ہی کر سکتا ہے۔

دن بھر آخر وہ پڑا ہی تو رہتا ہے۔ اسے رات کو جاگنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔" چنانچہ یہی طے ہوگیا اور کامران چوکیداری کرنے رات کو بیٹھ گیا۔ خالی بیٹھے بیٹھے اُسے اور تو کوئی کام تھا نہیں، لہٰذا وہ تاروں کو گننے لگا۔ وقت گزرتا گیا۔ آخر کار عین آدھی رات کو اُسے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سُنائی دی۔ اب جو وہ دیکھتا ہے تو سامنے ایک نہایت خوب صورت سفید گھوڑی چوکڑیاں بھرتی چلی آرہی ہے۔ کامران درخت کی آڑ میں چھپ کر گھوڑی کو دیکھتا رہا اور جوں ہی گھوڑی گھاس کھانے میں مشغول ہوئی لپک کر اس پر سوار ہونے لگا۔ گھوڑی نے کامران کو جو دیکھا تو وہ بھاگنے لگی، مگر کامران نے بڑے زور سے ایک جست لگائی اور گھوڑی کی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور پھر مضبوطی سے اس کے ایال پکڑ لیے۔ گھوڑی نے بڑی اُچھل کود کی اور چاہا کہ کامران کو گرادے، مگر کامران بھی اپنی دُھن کا پکّا تھا۔ وہ گھوڑی سے چمٹا ہی رہا۔ آخر کار گھوڑی تھک گئی اور کامران سے کہنے لگی، "تم تین روز تک مجھے کسی محفوظ مقام پر رہنے دو اور میری خوراک کا انتظام کردو، پھر اس کے بعد اگر تم مجھے آزاد کردو تو میں تمھیں ایک نہایت نادر تحفہ دُوں گی۔" کامران یہ سُن کر بڑا خوش ہوا، کیوں کہ آج تک کسی نے اُسے کوئی تحفہ نہ دیا تھا۔

چُناں چہ کامران نے گھوڑی کو ایک سنسان جگہ پر آرام سے رکھ دیا اور روز اُسے دانہ پانی دینے لگا۔ تیسرے روز صبح جب کامران وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھوڑی نے تین بچے دیے رکھے ہیں۔ یہ تینوں بچے بڑے خوب صورت تھے۔ دو تو ذرا بڑے تھے، لیکن تیسرا بچہ اتنا ننھا مُنّا تھا کہ بالکل کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ کامران اس چھوٹے بچے کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہوا۔ گھوڑی نے کامران سے کہا، "بڑے بچّوں کو تم بادشاہ کے ہاتھ فروخت کر دینا، مگر اس ننھے منّے گھوڑے کو نہ تو کسی کو دینا اور نہ فروخت کرنا۔ یہ ساری عمر تمھاری خدمت کرتا رہے گا اور تمھارا بہترین دوست ثابت ہوگا۔"

کامران ننھے منّے گھوڑے کو گود میں لیے بیٹھا گھوڑی کی یہ باتیں سُن رہا تھا۔ اب جو اس نے نظریں اُٹھا کر گھوڑی کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو دیکھا کہ گھوڑی غائب ہوچکی ہے۔ کامران حیران بیٹھا رہ گیا۔

اس کے بعد سے کامران اِن تینوں گھوڑوں کو دانہ پانی دیتا رہا۔ اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے اور اس عرصے میں گھوڑے بڑی تیزی سے بڑے ہوگئے، مگر ننھا منّا گھوڑا زیادہ بڑا نہ ہوا۔ اتفاق سے ایک رات جب کامران

سو گیا تو دانیال اس جگہ پہنچ گیا، جہاں پر یہ
گھوڑے تھے۔ دانیال نے جو یہ گھوڑے دیکھے
تو اس کے دل میں لالچ آ گیا۔ وہ فوراً جلال
کو بلا لایا اور گھوڑوں کو دکھا کر بولا، "کل شہر
میں میلہ لگنے والا ہے۔ بادشاہ کے اصطبل کے
لیے بھی لوگ گھوڑے خریدنے آئیں گے۔ چلو
بس ان گھوڑوں کو کل وہیں بیچ ڈالیں۔"

چناں چہ دوسرے دن صبح یہ دونوں
چپکے سے گئے اور دونوں بڑے گھوڑوں کو لے کر
روانہ ہو گئے۔ صرف وہ ننھا منا گھوڑا باقی رہ
گیا۔ کچھ دیر بعد جب کامران وہاں پہنچا، تو
گھوڑوں کو موجود نہ پا کر بڑا پریشان ہوا۔
اتنے میں وہ ننھا منا گھوڑا کامران کے پاس
آ گیا اور بولا، "تمھارے بھائی ان گھوڑوں کو
لے گئے ہیں، تاکہ انھیں فروخت کر ڈالیں۔"

ننھے گھوڑے کو باتیں کرتے دیکھ کر کامران
بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا، "اچھا تو تمھیں باتیں
کرنا بھی آتا ہے؟" اس پر ننھا گھوڑا بولا، "اب
تک مجھے بات کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ
آئی تھی۔ بہر حال اب وقت ضائع نہ کرنا
چاہیے۔ تم جلدی سے میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ،
جلدی کرو۔" کامران فوراً اس گھوڑے پر سوار
ہو گیا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی

تھوڑی ہی دیر گزرنے پائی تھی کہ سامنے اسے
اپنے دونوں بھائی دکھائی دے گئے۔ کامران
نے لپک کر انھیں پکڑ لیا۔ کامران کو دیکھ کر
دونوں بھائی باتیں بنانے لگے۔ بولے، "ہم لوگ
تو ان گھوڑوں پر سوار ہو کر صرف میلہ دیکھنے
جا رہے تھے۔" کامران نے کہا، "بہت خوب،
چلو میں بھی چلتا ہوں۔"

شہر میں بڑے ٹھاٹھ سے میلہ لگا ہوا تھا۔
بادشاہ کے اصطبل کے حاکم خاص بھی موجود تھے۔
انھوں نے جو کامران کے دونوں گھوڑوں کو دیکھا
تو اُن کی خوب صورتی پر عش عش کرنے لگے اور
فوراً بادشاہ کو بلا لائے۔ بادشاہ بھی ان گھوڑوں
کو دیکھ کر کہنے لگا، "بے شک، یہ گھوڑے تو واقعی
نہایت حسین ہیں۔ میں انھیں خاص اپنی سواری
کے لیے خریدوں گا۔" چناں چہ سودا ہو گیا اور
کامران کو بادشاہ نے دو تھیلیاں اشرفیوں کی
دے دیں اور گھوڑے خرید لیے۔ مگر جب بادشاہ
کے آدمی گھوڑوں کو لے کر چلنے لگے تو گھوڑے
اڑ گئے۔ کسی طرح چلنے کو راضی ہی نہ ہوتے۔
اس پر حاکم اصطبل بولا، "یہ گھوڑے اس لڑکے
کو چھوڑ کر ہرگز نہ جائیں گے۔" یہ سن کر بادشاہ
نے کامران سے کہا، "چونکہ یہ گھوڑے تمھارے
بغیر نہیں رہ سکتے، لہٰذا تم بھی میرے ساتھ چلو

آج سے تم بھی میرے اصطبل کے ایک حاکم مقرر کیے جاتے ہو۔"

چنانچہ کامران نے اشرفیوں کی تھیلیاں تو اپنے بھائیوں کے ہاتھ اپنے باپ کو روانہ کر دیں اور خود بادشاہ کے ہمراہ گھوڑے لے کر چل دیا۔ بادشاہ کے محل میں اُس کے دن بڑے آرام سے گزرنے لگے۔ اس کا ننھا منا گھوڑا ہر وقت اُس کے ساتھ رہا کرتا تھا، لیکن اصطبل کا حاکمِ خاص کامران سے جلنے لگا۔ چنانچہ اُس نے کامران کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ ایک دن اُس نے بادشاہ سے کہا، "جہاں پناہ، یہ لڑکا تو بڑی شیخیاں بگھارتا رہتا ہے۔ کل کہتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو سنہری ہرنی بھی پکڑ کر لے آؤں۔"

یہ سُن کر بادشاہ بڑے اشتیاق سے پوچھنے لگے، "ارے کیا وہی سنہری ہرنی جو اس دُور دراز جنوبی علاقے میں رہتی ہے؟ جاؤ کامران کو ابھی حاضر کرو۔"

جب کامران حاضر ہوا تو بادشاہ نے اُس سے سنہری ہرنی لانے کی فرمائش کی۔ کامران حیران ہو کر بولا، "مگر جہاں پناہ، میں تو جانتا بھی نہیں کہ یہ سنہری ہرنی ہے کہاں۔ بھلا میں اسے کیسے لا سکتا ہوں۔"

اس جواب سے بادشاہ سخت ناراض ہوا۔ بولا، "اچھا، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم حکم عدولی کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ، تین دن کے اندر ہرن کو ہمارے حضور پیش کرو، ورنہ تمھاری جان کی خیر نہیں۔"

بیچارہ کامران یہ سُن کر نہایت پریشان ہوا اور اصطبل واپس لوٹا۔ ننھے منے گھوڑے نے کامران کو پریشان جو دیکھا تو پوچھنے لگا، "میرے دوست، کیا بات ہے۔ تم پریشان کیوں ہو؟" کامران نے تمام ماجرا کہہ سُنایا۔ اس پر گھوڑا بولا، "گھبراؤ نہیں۔ بادشاہ سے کہو کہ وہ تمھیں ایک سونے کی بالٹی اور سونے کے دانے دے دیں اور ایک ریشمی رسی بھی دے دیں۔ ہم لوگ کل صبح پھر روانہ ہو جائیں گے۔" بادشاہ نے یہ سب چیزیں مہیا کروا دیں اور سورج نکلنے سے پہلے ہی کامران اپنے ننھے منے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ سورج ابھی اچھی طرح سے آسمان پر نمودار بھی نہ ہوا تھا کہ کامران آدھی دنیا کا سفر طے کر چکا تھا۔ گھوڑے نے کہا، "دیکھو، یہی ہے وہ جنوبی علاقہ، جہاں وہ سنہری ہرنی رہتی ہے۔" پھر گھوڑے نے کامران سے کہا کہ سنہرے دانے کو درختوں کے نیچے ڈال دے اور خود ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ سنہری ہرنی نمودار ہوئی اور دانہ کھانے آ گئی۔ کامران نے

ریشمی رسّی کا پھندا بنا کر بڑے زور سے ہرنی کے سر پر پھینکا۔ پھندا ٹھیک ہرنی کی گردن میں بیٹھ گیا۔ کامران نے تیزی سے رسّی گھسیٹنا شروع کر دی۔ پھندا ہرنی کی گردن میں کس گیا۔ چناں چہ ہرنی کو پکڑ کر کامران اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور واپس لوٹ آیا۔

بادشاہ نے جب سنہری ہرنی کو دیکھا تو وہ بے حد خوش ہوا، مگر اصطبل کا حاکم خاص اور جل گیا۔ چناں چہ اُس نے ایک دن بادشاہ سے کہا، "حضور، یہ کامران تو بڑی بڑی ڈینگیں مارتا رہتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اس خوب صورت شاہ زادی کو بھی اُٹھا لاؤں، جو اس دُور دراز شمالی علاقے میں رہتی ہے۔"

یہ سُن کر بادشاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا، "ارے، کیا وہی خوب صورت شاہ زادی جو سمندر کے کنارے کشتی میں گھومتی رہتی ہے؟ جاؤ، کامران کو ابھی بلواؤ۔"

جب کامران آگیا تو بادشاہ نے اُسے حکم دیا کہ شاہ زادی کو لے آئے۔ کامران نے عاجزی سے کہا، "جہاں پناہ، میں تو جانتا بھی نہیں کہ یہ شاہ زادی ہے کہاں۔" یہ سُن کر بادشاہ کو پھر طیش آگیا۔ بولا، "اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمھیں یہ زحمت گوارہ نہیں۔ جاؤ، چھٹے دن کے عرصے میں شاہ زادی کو ہمارے حضور میں حاضر کر دو، ورنہ تمھاری جان کی خیر نہیں۔"

بیچارہ کامران پھر پریشان حال اصطبل واپس لوٹا۔ ننھے گھوڑے نے جو کامران کی حالت دیکھی تو بولا، "کیا بات ہے؟" کامران نے تمام باتیں بتا دیں۔ سب سُن کر گھوڑا بولا، "اپنے آنسو پوچھ ڈالو۔ فوراً ایک ریشمی خیمہ حاصل کرو اور سونے چاندی کے برتن اور بہتر سے بہتر جو غذائیں ہو سکتی ہیں اُنھیں بھی ساتھ لے لو۔ ہم لوگ صبح تڑکے روانہ ہو جائیں گے۔" کامران نے فوراً ان سب چیزوں کا بندوبست کیا اور دوسرے دن صبح اپنے گھوڑے پر روانہ ہو گیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میلوں کا فاصلہ سکنڈوں میں طے ہو رہا تھا۔ آخر کار وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا، جہاں پر دنیا ختم تھی۔ گھوڑا یہاں رُک گیا۔ کامران گھوڑے سے اُتر پڑا۔ گھوڑے نے کہا، "اب یہاں پر تم اپنا خیمہ نصب کر دو اور وہ سونے چاندی کے برتن اس میں سجا کر رکھ دو، پھر ان برتنوں میں وہ تمام لذیذ غذائیں رکھ دو۔" کامران نے جب یہ سب کام کر لیے تو گھوڑا بولا، "اب تم چھپ جاؤ اور دیکھتے رہو۔ جب شاہ زادی آجائے اور خیمے میں داخل ہو کر کھانے میں مصروف ہو تو جا کر اُسے پکڑ لینا اور مجھے آواز

دے دینا۔"

چُناں چہ کامران انتظار کرنے لگا اور خیمے کی آڑ سے سمندر کی جانب دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک کشتی نظر آئی۔ کشتی کنارے آکر رُک گئی اور شاہ زادی کشتی میں سے اُتر کر دَوڑتی ہوئی خیمے کی جانب لپکی۔ شاہ زادی کو دیکھ کر کامران اُس کے حُسن سے مرعوب ہو گیا۔ شاہ زادی خیمے میں جاکر کھانے میں مصروف تھی کہ عین اسی وقت کامران نے اُسے جاکر پکڑ لیا اور گھوڑے کو پکارنے لگا۔ شاہ زادی چیخنے لگی، "مجھے چھوڑ دو! مجھے چھوڑ دو!" اتنے میں شاہ زادی نے گردن گھماکر جب کامران کی شکل دیکھی تو وہ قدرے مطمئن ہوئی اور پوچھنے لگی، "تم کون ہو؟" کامران نے کہا، "میں تو محض ایک بے وقوف ہوں، جسے لوگ کامران کہتے ہیں۔ میں تم کو بادشاہ کے پاس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" شاہ زادی بولی، "تم تو بڑے خوب صورت ہو۔ تمھارے ساتھ چلنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جہاں جی چاہے چلو۔"

چُناں چہ شاہ زادی کو لے کر کامران گھوڑے پر سوار ہو گیا اور واپس ہوا۔ راستے میں کامران سوچنے لگا کہ اس شاہ زادی سے تو مجھ کو محبت ہو گئی ہے پھر بھلا بادشاہ سے اس کی شادی میں کیسے برداشت کروں گا۔ غرض کامران اسی قسم کے خیالات میں غرق شاہی محل پہنچ گیا۔ شاہ زادی کو دیکھ کر بادشاہ کی باچھیں کِھل گئیں اور وہ یہ سوچ کر خوش ہونے لگا کہ میری ہونے والی دُلہن واقعی بڑی حسین ہے، مگر جب شاہ زادی بادشاہ کے پاس پہنچی تو وہ بولی، "کیا میری شادی آپ ہی کے ساتھ ہونے والی ہے؟ مگر آپ تو کامران کی طرح نہ جوان ہیں اور نہ خوب صورت۔" یہ سُن کر بادشاہ جوش میں آکر بولا، "لیکن میں ایک بہت عظیم بادشاہ ہوں اور پھر میرا دل تو ابھی اتنا ہی جوان ہے جتنا کہ کامران کا ہے۔" شاہ زادی بولی، "ممکن ہے کہ آپ درست فرماتے ہوں، مگر چوں کہ آپ کا دل تو مجھے دکھائی نہیں دیتا، اس لیے میں آپ سے شادی ہرگز نہ کروں گی۔" اس پر بادشاہ ناراض ہو کر بولا، "میں تمھیں ایک دن کی مہلت دیتا ہوں اس میں سوچ لو۔ اس کے بعد چاہے تم پسند کرو یا نہ کرو میں تمھارے ساتھ شادی کر ڈالوں گا۔"

یہ سُن کر شاہ زادی کو بڑا صدمہ ہوا۔ وہ کامران کے ساتھ واپس جانے لگی۔ راستے میں اس نے کامران سے کہا، "کامران میں اس سے شادی ہرگز نہ کروں گی چاہے جو کچھ بھی ہو۔ وہ تو بالکل بڈھا کھوسٹ ہے۔" کامران نے تسلی

دیتے ہوئے کہا، "گھبراؤ نہیں شاہ زادی، میں ابھی اپنے ننھے منے گھوڑے سے پوچھتا ہوں۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی ترکیب نکال لے گا۔"

چناں چہ شاہ زادی اور کامران گھوڑے کے پاس پہنچے اور تمام باتیں بتا دیں۔ گھوڑا نہایت سنجیدگی سے تمام باتیں سنتا رہا، پھر بولا، "اس مرتبہ تم نے بڑا مشکل مسئلہ میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ بہر حال میں تمھیں جو صلاح دیتا ہوں، اُسے خوب غور سے سنو اور اسی پر عمل کرو۔" اس کے بعد گھوڑے نے چپکے سے ان دونوں سے کچھ کہہ دیا۔

دوسرے دن شاہ زادی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئی اور بولی، "آپ فرماتے ہیں کہ آپ کا دل جوان ہے، اس لیے اگر آپ بھی اتنے ہی جوان ہو جائیں جتنا کہ آپ کا دل ہے تو پھر میں آپ سے شادی کرلوں گی۔"

یہ سُن کر بادشاہ بڑا چکرایا۔ کہنے لگا، "بھلا انسان دوبارہ جوان کیسے ہو سکتا ہے؟" شاہ زادی نے کہا، "حضور ایک طریقہ ہے۔ اگر انسان بکری کے دودھ میں ایک منٹ کے لیے ڈبکی لگالے تو پھر وہ اتنا ہی جوان ہو سکتا ہے، جتنا کہ اس کا دل۔"

بادشاہ بڑی حیرت سے بولا، "واقعی کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" شاہ زادی نے کہا، "جی ہاں، ہمارے ملک میں تو یہ عام دستور ہے اب آپ خود ہی دیکھ لیجیے گا کہ آپ کا دل واقعی اتنا ہی جوان ہے جتنا کہ آپ کہتے ہیں۔"

بادشاہ بولا، "ہاں، ہاں، میں سچ کہتا ہوں!" اور یہ کہہ کر بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ ایک بڑی سی دیگ میں بکری کا دودھ بھر کر پیش کیا جائے۔ فوراً خدام دوڑ گئے اور ذرا ہی دیر میں ایک بڑی سی دیگ بکری کے دودھ سے بھری ہوئی لاکر رکھ دی گئی۔ تمام حاضرینِ دربار حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے شاہ زادی سے کہا، "اب میں تم کو دکھادوں گا کہ میرا دل بھی کامران کی طرح جوان ہے۔" شاہ زادی مسکرا کر بولی، "کیوں نہیں! لیکن اگر فرض کیجیے بعد میں یہ ثابت ہوا کہ آپ کا دل اتنا جوان نہیں ہے تب؟" یہ سوال سُن کر بادشاہ کا منھ کھلا رہ گیا، پھر ذرا دیر بعد بولے، "کیا کہا؟ جوان نہیں ہے؟ اچھا اگر یہ بات نکلے تو پھر تم کامران کے ساتھ شادی کرلینا۔ میں بخوشی اجازت دے دوں گا، مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ تم ابھی دیکھ لوگی اور ایک ہی منٹ کے اندر میں ایسا جوان نظر آنے لگوں گا کہ تم مجھ سے شادی کر کے فخر محسوس

کرنے لگوگی۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے دیگ میں ایک ڈبکی لگائی۔ بادشاہ کا سارا جسم دودھ کے اندر ڈوب گیا۔ سب لوگ ایک منٹ کے وقفے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ ایک منٹ ایک گھنٹہ معلوم ہونے لگا۔ آخر کار وقت پورا ہوا اور بادشاہ باہر نکلنے لگا۔ لوگ بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ دیگ کے باہر نکل کر بادشاہ بڑے فخر سے مجمع کی طرف دیکھ رہے تھے اور مسکراتے جا رہے تھے۔ درباریوں نے جو دیکھا تو آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی اور لوگ کہنے لگے ارے یہ تو ذرا بھی نہیں بدلے۔ شاہ زادی نے آگے بڑھ کر بادشاہ سے کہا، "جہاں پناہ، مجھے افسوس ہے مگر اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ آپ کا دل اتنا جوان نہیں جتنا کہ آپ خیال کرتے ہیں۔"

بادشاہ نے بڑے تعجب سے پوچھا، "ہائیں! کیا میں اب جوان اور خوبصورت نہیں ہوگیا؟"

شاہ زادی نے فوراً لپک کر بادشاہ کے سامنے ایک آئینہ پیش کر دیا۔ آئینے میں بادشاہ کو جب اپنی وہی پُرانی کھوسٹ شکل نظر آئی تو وہ بڑے غم زدہ لہجے میں بولے، "تم ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی میں تم سے شادی کرنے کے لائق نہیں۔ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

شاہ زادی نے فوراً کہا، "لیکن آپ خدا نخواستہ ابھی اتنے ضعیف بھی نہیں کہ ہم دونوں کی شادی نہ کروا سکیں۔"

اس پر بادشاہ نے کہا، "ہاں ہاں، یہ میں ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے فوراً شاہ زادی کی شادی کامران سے کروا دی اور دونوں کو بہت سے تحفے تحائف بھی دیے۔ پھر کامران اور شاہ زادی اسی ننھے منے گھوڑے پر سوار ہو کر شاہ زادی کے وطن کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں کامران نے کہا،

"آج ہمیں یہ ساری خوشی اسی گھوڑے کی عقل مندی کی بدولت نصیب ہوئی۔ بکری کے دودھ میں ڈبکی لگانے والی ترکیب واقعی اس نے خوب بتائی۔"

شاہ زادی اور کامران جب شاہ زادی کے وطن پہنچ گئے تو یہ دونوں آرام سے وہاں حکومت کرنے لگے۔ ان کا وفادار گھوڑا بھی دربار میں کامران اور شاہ زادی کے درمیان ہر وقت بیٹھا رہتا تھا۔

کچھ کہو کچھ سنو

محمد یونس - ایبٹ آباد

س : آج کل کراچی کا موسم کیسا ہے؟

ج : کراچی کا موسم آج تو بہت خوش گوار ہے۔ کل کا محکمۂ موسمیات کو پتا ہے۔

عبدالحق - کھلنا

س : اٹلی کے سکّہ کو کیا کہتے ہیں؟

ج : "لیرا"

اعجاز احمد - کراچی

س : یوگو سلاویہ کے صدر کون ہیں؟

ج : مارشل ٹیٹو یوگوسلاویہ کے صدر ہیں۔

غلام محمد - ٹنڈو جام

س : ۱۹۳۶ء کے اولمپک مقابلے کس ملک میں ہوئے تھے؟

ج : جرمنی (برلن) میں۔

ریاض احمد شہزاد - حیدرآباد

س : دنیا؟

ج : امتحان گاہ۔

عتیق الرحمٰن - ڈھاکہ

س : دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ؟

ج : "گرین لینڈ" دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ بتایا جاتا ہے۔

عرفان احمد - کراچی

س : دنیا کا گنجان تر علاقہ؟

ج : ہمارا اپنا مشرقی پاکستان ہے۔

محمد علی - حیدرآباد

س: ایک کہانی بھیجوں تو کیا شائع کردیں گے؟

ج: نونہال ادیب کے صفحات تمھارے لیے ہی ہیں، ضرور بھیجو۔

طاہرہ حمید - کوئٹہ

س: بھیا آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟

ج: جی ہاں، میرے لائق کوئی خدمت۔

فضل مبین - پشاور

س: تبریز کہاں واقع ہے اور اس کی آبادی کتنی ہے؟

ج: ایران کے صوبے آذربائی جان کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۳ لاکھ ہے

شمشیر احمد - ڈھاکہ

س: ہمدرد نونہال کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں؟

ج: آٹھ رُپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دو، تم خریدار بن جاؤ گے۔

یوسف خورشید - لاہور

س: آپ سے میں کس طرح مل سکتا ہوں؟

ج: جب تم کراچی آؤ تو ہم سے ملنے ہمارے دفتر بلا تکلف آسکتے ہو۔

شمیم اختر - حیدرآباد

س: آئینہ کی تعریف؟

ج: آئینہ دیکھ لو، پھر تعریف معلوم ہوجائے گی۔

نسیم اللہ - چاٹگام

س: نیک نام کیسے حاصل ہوتا ہے؟

ج: نیک کام کرنے والا نیک نام ہوجاتا ہے۔

شہلا اقبال - حیدرآباد

س: نونہال شائع کرنے سے آپ کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

ج: نونہال پڑھ کر تم فائدہ اٹھاتے ہو، یہی ہمارا فائدہ ہے۔

وقار رئیس - کراچی

س: جو بچے اسکول نہیں جاتے اُن کو کیا کہنا چاہیے؟

ج: یہ تو کان میں کہنے کی بات ہے۔ کچھ بُرا نام رکھو گے تو وہ اور "بدشوق" ہوجائیں گے۔

نونہال ادیب

محنت کا پھل

ساجدہ خاتون
راولپنڈی

کسی گاؤں میں دو مچھیرے رہتے تھے۔ ایک کا نام راجو اور دوسرے کا نام رامو تھا۔ راجو بہت محنتی اور نیک دل آدمی تھا۔ وہ صبح سے شام تک دریا میں جال لگائے بیٹھا رہتا۔ جب بہت سی مچھلیاں پکڑ لیتا تو شہر میں جاتا۔ وہاں پر مچھلیاں فروخت کر کے اپنے بیوی بچوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لے آتا تھا۔ رامو بے حد لالچی اور خود غرض آدمی تھا۔ وہ راجو سے بہت حسد کرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر جال لگائے رکھتا۔ جب مچھلی نہ آتی تو گھر واپس آجاتا۔ اس کی بیوی اس کو لاکھ سمجھاتی کہ وہ اپنے بیوی بچوں کی خراب حالت سدھارے۔ اور اس مچھیرے کو دیکھے جو کہ محنت سے کماتا ہے۔ اور سکھ چین سے زندگی بسر

کرتا ہے۔ راجو خود بھی اسے بہتر سمجھتا، لیکن وہ اِن سب کی باتوں کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے اڑا دیتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بادشاہ، ملکہ اور شہزادی دریا کی سیر کر رہے تھے کہ شہزادی کی قیمتی انگوٹھی دریا میں گر گئی۔ شہزادی کو اس کا بہت افسوس تھا۔ بادشاہ کو ڈر تھا کہ کہیں شہزادی اس غم میں بیمار نہ ہو جائے۔ اُس نے اپنے ملک کے تمام مچھیروں کو حکم دیا کہ "جو شہزادی کی قیمتی انگوٹھی ڈھونڈ کر لائے گا۔ اُس کو بہت سے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اگر وہ ڈھونڈنے میں ناکام ہوا تو ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔" راجو نے جب یہ سنا تو وہ بھی تیار ہو گیا اور اپنے دوست رامو کو بھی کہا کہ "آؤ یار ہم بھی قسمت آزماتے ہیں۔" رامو نہ مانا اس نے تو صاف انکار کر دیا کہ ہم سے اتنا مشکل کام نہ ہو سکے گا۔ جب راجو نے یہ سنا تو وہ مایوس ہو گیا اور اکیلا ہی سویرے بادشاہ کے دربار کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں بھی اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اسے اجازت دے دی۔ مچھیرے نے یہ سنا اور خدا کا نام لے کر دریا میں چھلانگ لگا دی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شہزادی کی انگوٹھی تھی۔ سب لوگ حیرت بھری نگاہوں سے اُسے تک رہے تھے۔ شہزادی نے بھی جب انگوٹھی کو دیکھا تو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چوما۔ بادشاہ نے اسے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ اسے اپنے شہر میں بلا کر ایک شاندار سا مکان دیا، جس میں ہر طرح کی آرائش کا سامان میسّر تھا۔ اب راجو دولت مند آدمی تھا، کیوں نہ ہوتا۔ اس نے تو بہت محنت کی تھی۔ جب رامو نے راجو کی یہ حالت دیکھی تو اپنے ہاتھ ملنے لگا اور پچھتانے لگا کہ اس نے اتنا سنہری موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیا۔ اگر میں چلا جاتا تو انگوٹھی ڈھونڈ کر انعام کا حق دار ہوتا، لیکن اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

ہوائی جہاز کی کہانی

حسن آذر جعفری
کراچی

کراچی کا ایر پورٹ ایشیا کا مصروف ترین ایر پورٹ ہے۔ جہاں روزانہ کئی جہاز آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ کتنے ہی جہاز ہمارے سر پر سے اڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اس کی ایجاد بھی انسانی عقل کا کمال ہے۔ پہلے انسان پرندوں کو دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتا تھا کہ کاش وہ بھی اسی طرح اڑ سکے اور لمحہ بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ آخر اس نے اپنی یہ خواہش بھی پوری کر ہی لی اور اب وہ ہر جگہ اڑ سکتا ہے۔

ہوائی جہاز بنانے کی سب سے پہلی کوشش "مونٹ گریفر" نے کی۔ اس نے چمڑے کا ایک غبارہ بنایا اور اس میں خوب دھواں بھرا جب یہ غبارہ دھوئیں سے بالکل بھر گیا اور ہوا چلی تو اس کے ساتھ اڑنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا سے گرم ہوا زیادہ ہلکی ہوتی ہے، اس لیے گرم ہوا سے بھرا ہوا غبارہ ٹھنڈی ہوا پر بہت دیر تک اڑتا رہا۔ چند میل کی اونچائی پر جاکر جب بھاپ کا زور ختم ہو گیا تو یہ غبارہ نیچے اتر آیا، مگر یہ کوشش کچھ ناکام رہی، کیوں کہ یہ ہوا سے زیادہ ہلکی نہ تھی۔ آخر سائنس والوں کی سمجھ میں ایک بہت ہلکی گیس آگئی۔ جس کا نام ہائیڈروجن ہے۔ اب غبارہ میں ہائیڈروجن بھر کر اڑایا گیا۔ ہائیڈروجن کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں آگ لگنے کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ جرمنی کے کونٹ زیپلن نے اس غبارے کو مکمل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے المونیم کا چھلا اور سگار نما ڈھانچہ تیار کیا۔ جسے کئی کمروں میں تقسیم کیا۔ ہر کمرے میں علیحدہ علیحدہ

گیس کے تھیلے رکھے پھر تمام ڈھانچے کو ریشم سے بند کر دیا۔ نشست کی جگہ غبارہ سے نیچے رکھی۔ یہ غبارہ دوسرے غباروں کے مقابلے میں بہتر تھا مگر آگ لگنے کا خطرہ اس میں بھی تھا۔

امریکہ والوں نے ایک دوسری گیس ہلیم دریافت کی، مگر یہ قیمتی بہت تھی۔ اس لیے اس کا خیال چھوڑنا پڑا۔ کوشش بہر حال جاری رہی۔ سب سے پہلے لینگلی نے ہوائی جہاز میں انجن لگا کر اڑانے کی کوشش کی، مگر وہ جلد ہی مر گیا۔ اور اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس کے بعد رئٹ برادران نے ایسا ہوائی جہاز بنالیا، جس کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ انسان ہوا میں سہولت سے اڑ سکے گا۔ اب جب کہ ہوائی جہاز مکمل ہو کر بہت ترقی بھی کر گیا ہے۔ لوگوں کو ابتدائی دشواریوں کا خیال تک نہیں آتا۔ اب ہر روز اس کی رفتار بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آواز سے زیادہ تیز رفتار جہاز بنالیے گئے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں جو عالمگیر جنگ چھڑی اس میں جو نقصانات ہوئے تو ہوئے، مگر ہوائی جہاز کی جو ترقی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

ہوائی جہاز ہی کی ایک اور قسم ہیلی کاپٹر ہے۔ اسے اگر مشینی پرندہ کہیں تو غلط نہ ہوگا، کیوں کہ وہ ہر جگہ اتر سکتا ہے۔

پہلے ہوائی جہاز صرف خاص کاموں کے لیے استعمال ہوتے تھے، مگر اب تو ایک شہر سے دوسرے شہر مسافروں کو لانے اور لے جانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ وہ چیزیں جو دیر ہونے پر خراب ہو جاتی ہیں۔ اب باآسانی چند گھنٹوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر ہوائی جہاز کے ذریعہ بھیجی جاسکتی ہیں۔

ایمان داری

عزیز احمد
لاہور

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی شہر میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام قاسم تھا۔ وہ بہت ایماندار اور سخی تھا۔ اس کی ایمانداری اور سخاوت کا چرچا دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ جہاں دیکھو، لوگ اسی کے متعلق باتیں کرتے تھے۔

اس امیر کے گھر سے کبھی کوئی شخص خالی نہیں جاتا تھا۔ اس کے دسترخوان پر ہمیشہ سینکڑوں لوگ کھانا کھاتے تھے۔ وہ امیر، غریب لوگوں کی بہت مدد کیا کرتا تھا اور لوگ اس کی سخاوت اور ایمانداری کی مثال دیا کرتے تھے۔

غرض کہ ہوتے ہوتے یہ باتیں بادشاہ کے کانوں تک جا پہنچیں۔ اچھے اور بُرے لوگ تو سبھی جگہ موجود ہوتے ہیں۔ چناں چہ بادشاہ کے کچھ درباریوں اور دوسرے لوگوں نے جو کہ اس امیر سے جلتے تھے۔ بادشاہ کو امیر کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔

آخر بادشاہ ان لوگوں کی باتوں میں آگیا، چناں چہ اس نے اُس امیر کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک دن وہ بھیس بدل کر اس امیر کو آزمانے کے لیے روانہ ہوا۔ جب وہ قاسم کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بہت سے لوگ دسترخوان بچھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بادشاہ ابھی وہاں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص آگے بڑھا اور بادشاہ کو مخاطب کرکے بولا، "آئیے حضور! یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ آپ بیٹھیے میں آپ کا گھوڑا باندھ آؤں۔"

جب وہ شخص گھوڑا باندھ کر آیا تو بادشاہ نے کہا کہ "میں اس مکان کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔" یہ سن کر اُس شخص نے نظریں جھکالیں اور بولا، "جناب عالی مالک مکان تو یہی ہے۔ جو آپ کی خدمت کر رہا ہے۔"

بادشاہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور دل میں اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اتنی دیر میں دسترخوان

بچھا دیا گیا۔ بادشاہ نے بھی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔

جب سب کھانا کھا چکے تو بادشاہ اور امیر باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ باتوں کے دوران امیر بادشاہ سے کہنے لگا، "اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف فرمائیے۔"

بادشاہ نے کہا، "مہربانی کا بہت بہت شکریہ، اگر آپ کا یہی اصرار ہے تو میں آپ سے کچھ مانگ ہی لوں۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے سامنے والے پیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "اس پیڑ سے کچھ آم توڑ دیجیے۔"

یہ سن کر امیر نہایت غمگین ہو گیا اور بولا کہ "میں اپنے مہمان کے لیے جان تک قربان کر سکتا ہوں، لیکن یہ بات میرے بس سے باہر ہے، کیوں کہ یہ درخت سرکاری ہے۔ جب تک بادشاہ کے آدمی بادشاہ کا حصہ نہیں لے جاتے، اُس وقت تک میں اس پیڑ کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔"

یہ سن کر بادشاہ حیران رہ گیا اور دل ہی دل میں اس کی ایمانداری کی تعریف کرنے لگا، پھر جب بادشاہ وہاں سے رخصت ہو کر راجدھانی پہنچا تو اس نے سب سے پہلے یہی کام کیا کہ اس امیر کو جس علاقے کا وہ رہنے والا تھا۔ وہاں کا حاکم بنا دیا اور اسے دربار میں بلا کر قیمتی خلعت سے نوازا۔ امیر نے خدا کا شکر ادا کیا اسے یہ انعام ایمانداری اور سخاوت کی وجہ سے ملا تھا۔

وفادار سپاہی

ابراہیم محمد آگریا
کراچی

فرانس کی شمالی سرحد پر پیری ایک غریب کسان رہتا تھا۔ اس نے

دن رات محنت کر کے تھوڑی سی رقم جمع کی اور ایک پہاڑی پر زمین خرید کر ایک چھوٹی سی کٹیا بنائی، سفید پتھر کی بنی ہوئی یہ چھوٹی سی کٹیا، اس سرسبز پہاڑی پر بڑی خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ پیری کو اس کٹیا کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ یہی اس کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں سمیت اس کٹیا میں بڑے چین سے رہنے لگا۔ اس نے کٹیا کے اردگرد ایک چھوٹا سا باغ بھی لگا رکھا تھا اور وہ اس کٹیا اور باغ کو جنت کا ٹکڑا کہتا تھا۔ ان ہی دنوں فرانس اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی اور فرانس کی حکومت نے جبری بھرتی شروع کر دی، چناں چہ پیری کو بھی فوج میں بھرتی کر کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ وہ بڑا اچھا نشانہ باز تھا، اس لیے اس کو توپچی مقرر کیا گیا۔ جرمن فوجوں نے فرانس کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا، پیری کا گاؤں بھی جرمنوں کے قبضے میں چلا گیا اور سب لوگ وہاں سے بھاگ کر شہر چلے گئے۔ فرانسیسی فوجوں نے اپنے مورچے بنا کر توپیں نصب کر لیں، اور جرمنوں کو اس علاقے سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس مورچے میں پیری بھی توپچی کی حیثیت سے موجود تھا۔ ایک صبح وہ اپنی توپ کے پاس کھڑا تھا کہ اس کا کپتان وہاں آ نکلا، پیری کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دور بین نکالی اور سامنے کے علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ "توپچی"! اچانک کپتان بولا، "ہاں جناب"! پیری نے چوکنا ہو کر کہا۔ "وہ سامنے والی پہاڑی دیکھ رہے ہو؟" کپتان نے پیری کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ہاں جناب" "اور وہ سفید مکان جو اس پہاڑی کے اوپر ہے۔" "دیکھ رہا ہوں جناب"۔ "میرا خیال ہے وہاں جرمن چھپے بیٹھے ہیں، اس جھونپڑی کو اڑا دو۔" پیری کا رنگ زرد پڑ گیا اور سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پر چمکنے لگے۔ "توپچی" کپتان نے گرج کر کہا، سنا نہیں تم نے؟ اس جھونپڑی کو اڑا دو۔" "بہت اچھا جناب"۔ پیری نے توپ کا رُخ سیدھا کیا اور نشانہ باندھ کر گولہ

داغ دیا کپتان نے دوربین لگا کر دیکھا۔ گولا عین نشانے پر لگا تھا۔ "شاباش توپچی" کپتان نے مسکراتے ہوئے پیری کی طرف دیکھا، خوب نشانہ باندھا ہے تم نے۔ جھونپڑی بالکل تباہ ہوگئی ہے، مگر کپتان کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ توپچی کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔ کیا بات ہے توپچی؟ تمھاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ معاف کیجیے جناب، پیری نے روتی آواز میں کہا۔ "یہ جھونپڑی میری تھی، میری عمر بھر کی کمائی!"

بھیڑیے کی دم

محمد رمضان شاہ
باغبان پورہ لاہور

آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے کہ روس کے کسی شہر میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا رہتے تھے۔ یہ بے چارے بہت غریب تھے۔ بوڑھا روزانہ مچھلیاں پکڑ لاتا اور ان کو فروخت کر دیتا۔ جتنے پیسے ملتے ان سے اپنا اور بیوی کا پیٹ پالتا۔ ایک دن صبح جب بوڑھا دریا پر گیا تو پہلی ہی مرتبہ جال ڈالنے پر بہت سی مچھلیاں آن پھنسیں۔ بوڑھے نے ان سب کو اپنی گاڑی میں لادا اور گھر کا راستہ لیا۔ راستے میں اس کی نظر ایک لومڑی پر پڑی جو سردی سے ٹھٹھری ہوئی مردہ سی پڑی تھی۔ بوڑھا اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اسے اٹھا کر گاڑی میں رکھ لیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ "جب وہ گھر جا کر بڑھیا سے یہ کہے گا کہ آج وہ اس کے کوٹ کے لیے لومڑی کی کھال لایا ہے اور اب وہ سردی سے بچ جائے گی تو وہ کتنی خوش ہوگی۔" لومڑی نے تو ٹھٹھرنے کا صرف بہانہ ہی کیا تھا۔ گاڑی میں پہنچتے ہی اس نے تمام مچھلیاں ایک ایک کر کے نیچے پھینک دیں، پھر خود چپکے سے سڑک پر کود گئی۔ بوڑھا اپنے خیالوں میں مگن تھا۔ اس کو اس تمام کارروائی کی بالکل خبر نہ ہونے پائی۔ گھر پہنچ کر

اس نے دروازے سے بڑھیا کو پکار کر کہا کہ آج وہ لومڑی لایا ہے اور بہت سی مچھلیاں بھی ہاتھ آگئی ہیں۔ بڑھیا بھاگی بھاگی آئی، لیکن گاڑی بالکل خالی تھی۔

ادھر لومڑی نے ساری مچھلیاں اکٹھی کیں اور ایک جگہ بیٹھ کر انھیں کھانے کی تیاری کر رہی تھی کہ ایک بھیڑیا بھی ادھر آنکلا۔ سلام کر کے لومڑی سے بولا۔ "آج اکیلی بیٹھی کیا کھا رہی ہو ہمیں حصہ نہیں ملے گا؟" لومڑی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا، "یہ تھوڑی سی مچھلیاں بڑی محنت سے حاصل ہوئی ہیں، اگر تم بھی کھانا چاہتے ہو تو خود پکڑ لاؤ۔" "مجھے مچھلیاں پکڑنے کا طریقہ نہیں آتا۔" بھیڑیے نے کہا۔ لومڑی نے جواب دیا۔ "نہیں آتا! اچھا طریقہ میں بتاتی ہوں۔ ندی میں اپنی دم لٹکا کر بیٹھ جاؤ اور چلا کر کہو، "آجاؤ مچھلیو! آجاؤ مچھلیو!" ایسا کرنے سے تمھارے قریب بہت سی مچھلیاں آجائیں گی، پھر تم اُن کو پکڑ لینا۔ بھیڑیا وہاں سے سیدھا ندی پر گیا اور اپنی دم ندی میں لٹکا کر سوچنے لگا کہ اگر میں صرف "مچھلیو آجاؤ" کہوں تو شاید چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہی آئیں۔ اس لیے اس نے پکارنا شروع کیا۔ "چھوٹی مچھلیو! آجاؤ، بڑی مچھلیو! آجاؤ" وہ تمام رات اسی طرح پکارتا رہا۔ حتیٰ کہ اسے پانی جم جانے کا بھی احساس نہ ہوا۔ صبح لوگوں نے بھیڑیے کو دیکھا تو وہ اسے مارنے دوڑے۔ بھیڑیے نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کی دم ٹوٹ کر اسی جگہ رہ گئی وہ خود دُور جا گرا۔ لوگوں نے فوراً ہی اسے مار ڈالا۔ بچو ہمیشہ جو کام کرو پہلے اس کا انجام ضرور سوچ لو۔

دھوبی کا گدھا اور مکئی

صفیہ مغل، - پشاور شہر

کسی گاؤں میں ایک دھوبی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک گدھا تھا۔ وہ اس گدھے پر کپڑے لادا کرتا۔ اسی دھوبی کا ایک دوست تھا جس کا نام کبیر تھا جو کہ دھوبی کے گھر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ کبیر کو کاشت کاری کا شوق تھا۔ اسی شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے گھر کے ساتھ ہی زمین خرید کر اس میں مکئی بو دی اور مکئی کے پودے بڑے بڑے ہو گئے پھر ایک دفعہ کبیر کو کسی کام سے شہر جانا پڑا وہ دھوبی کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ بھائی ذرا میرے گھر اور مکئی کے کھیت کا خیال رکھنا۔ دھوبی نے کہا کہ بہت اچھا اور کبیر چلا گیا۔ دوسرے دن دھوبی کے پاس پیسے نہیں تھے کہ وہ گدھے کو گھاس لاکر ڈالتا۔ اس نے سوچا کہ چلو کبیر کے کھیت سے مکئی کاٹ کر گدھے کو کھلا دوں۔ وہ اٹھ کر گیا اور کبیر کے کھیت سے مکئی لاکر گدھے کو کھلا دی اور سو رہا جب وہ صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اُس کا گدھا غائب ہے، وہ گدھے کو تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا، لیکن اُس کو گدھا نہ ملا۔

جب وہ بہت تھک گیا تو گھر آکر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اُس کا گدھا خدا جانے کون لے گیا ہے۔ سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ رات کو اُس نے کبیر کے کھیت سے بغیر اجازت مکئی کاٹ کر گدھے کو کھلائی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور کبیر کے ہاں پہنچا تو کبیر گھر پر آچکا تھا۔ اس نے کبیر سے کہا کہ بھائی میں نے بغیر اجازت تمھارے کھیت سے مکئی کاٹ کر گدھے کو کھلائی تھی۔ اب میرا گدھا غائب ہو گیا ہے۔ مجھے معاف کر دو تاکہ میرا گدھا مل جائے۔ کبیر نے اُسے معاف کر دیا اور وہ جب کبیر کے گھر سے باہر نکلا تو اس کا گدھا سامنے سے آرہا تھا۔ دھوبی گدھے کو پاکر بہت خوش ہوا، کیوں کہ اسی کے ذریعے وہ کپڑے لاتا اور لے جاتا تھا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم کسی کی کوئی چیز بغیر اجازت لیے نہ اٹھائیں، کیوں کہ یہ چوری ہو جاتی ہے اور دنیا اور آخرت میں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

...

وقت کی اہمیت

محمد اسحاق زاہد
ملتان شہر

وقت کے ہر لمحے کو بیش بہا جاننا چاہیے۔ اس جہانِ فانی میں اگر ہم وقت کو بیکار صرف کریں گے تو ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر ہم وقت کو کچھ اہمیت دیں تو یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ چاہے کتنا ہی مشکل کام کیوں نہ ہو اگر آپ اُسے وقت پر سرانجام دیں گے تو وہ آپ کو قدرے آسان نظر آئے گا۔ وہی کام اگر ہم کل پر ڈال دیں تو یہ اچھی بات نہیں، کیوں کہ ہمیں اس کام میں اور بھی مشکلات پیش آنے لگیں گی۔ ہم کو آسان کام بھی مشکل نظر آئے گا اور پھر ہم مختصر سے کاموں سے بھی گریز کریں گے۔ ہم میں ایسی کاہلی پیدا ہو جائے گی کہ ہمیں وقت تک کا خیال نہیں رہ سکے گا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ وقت کا خیال رکھیں، وقت پر کام کرنا سیکھیں اور وقت پر ہر کام سرانجام دیں۔ آج کا کام کل پہ نہ ڈالیں۔ اسے اسی وقت نبھانے کی کوشش کریں۔ اس سے ہماری سب تکلیفیں دُور ہو جائیں گی۔

وقت پر اٹھنا بیٹھنا، وقت پر کھانا پینا، وقت پر پڑھنا لکھنا، وقت پر کھیلنا کودنا اور وقت پر سونا ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا۔

وقت کو دنیا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ جدھر نظر اٹھاؤ اُدھر وقت پر ہر کام ہوتا نظر آئے گا۔ ذرا بازار کی طرف نظر اٹھاؤ، دکانیں باقاعدگی سے صبح سویرے کھلتی اور دن ڈھلے بند ہو جاتی ہیں۔ ہر دکاندار باقاعدگی سے صبح سویرے دکان پر آتا اور شام کو چلا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا وہ دوپہر کو دکان نہیں کھول سکتا اور سہ پہر کو دکان بند نہیں کر سکتا۔ ہر دکاندار ایسا کر تو سکتا ہے، لیکن اس طرح اس کی زندگی چین سے کٹ جائے گی؟ نہیں اس سے اس کی زندگی چین سے نہیں کٹ سکتی۔ ذرا خود ہی ٹھنڈے دل

سے سوچیے کہ چند گھنٹے یا چند ساعت دکان پر بیٹھنے سے اسے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طرح تو وہ بھوکوں مر جائے گا۔

اُسے اپنی روزی کا احساس ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ وقت کی اہمیت کو جانتا ہے۔ اُسے وقت کا بہت خیال ہے۔ وقت ضائع کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ گویا وقت کا تعلق روزی اور عزت سے بھی ہے۔ وقت کی اہمیت کے پیش نظر وہ آرام و سکون سے رہ سکتا ہے۔ اگر وہ وقت کی اہمیت کو نہ جانے اور بر وقت کام نہ کرے تو اس کے لیے چین کا حصول مشکل امر ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم وقت کو ضائع کرنے سے گریز کریں اور ہر قیمتی لمحے کو کام میں صرف کر دیں۔ بے کار رہنے کے بجائے اگر ہم وقت کو اچھے کام میں صرف کریں تو ہم اس دنیا میں چین و سکون کا سانس لے سکتے ہیں، مگر جب وقت ہاتھ سے نکل جائے تو پچھتانے سے کچھ نہیں بن سکتا۔ بیتے لمحات واپس نہیں آ سکتے۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اگر ہم اپنا زیادہ تر وقت علم حاصل کرنے میں صرف کریں تو ہم دنیا و آخرت میں عزت و وجاہت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ اور اگر ہم اپنا زیادہ تر وقت بیکار کھیل کود میں صرف کریں تو ہم پر ذلت کی گھٹا چھا جائے گی اور میرے خیال میں کوئی شخص ذلت کی زندگی بسر کرنا پسند نہیں کر سکتا۔ ہر انسان عزت و راحت کی زندگی کا خواہاں ہے اور عزت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے بیش قیمت وقت کو اچھے کاموں میں صرف کریں۔

اس دور میں ہم اور ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ترقی وقت کو اہم کاموں پر صرف کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہماری

قوم ابھی وقت کی اہمیت کو اچھی طرح نہیں جانتی۔ ترقی کی راہ میں بے کاری بھی حائل ہے۔ نہیں تو ہم انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہوتے۔

انگریزوں کی ترقی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر وقت کام میں مشغول رکھتے ہیں۔ وہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ کو معمولی سے معمولی کاموں میں بھی مصروف رکھتا ہے۔ وہ فضول وقت صرف نہیں کرتے۔

گھومنے اور پھرنے اور سیر و تفریح کا بھی وقت مقرر ہے۔ ان کی ترقی کا راز یہی ہے۔ وہ وقت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ اور وقت کی قدر کرتے ہیں۔ قوم و ملک کی مدد کرنے سے جھجکتے اور اور گھبراتے نہیں۔

اس لیے عزیزان من، اگر ہم وقت کی قدر و منزلت اور اہمیت پہچان لیں تو ہم ترقی کی منازل آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔ اور ہم اور ہماری قوم اونچی قوموں میں شمار ہوگی۔ ہمارا درجہ سب سے بلند ہوگا۔ ہماری دنیا و آخرت میں عزت ہوگی۔ ہم چین کی زندگی بسر کر سکیں گے۔

دنیا میں سب سے بڑا ....

شہر	ٹوکیو (جاپان)
جہاز	کوئین الزبتھ
پُل	سڈنی ہاربر برج (آسٹریلیا)
گھنٹہ	گریٹ بل (ماسکو)
برِاعظم	ایشیا
سمندر	بحرالکاہل
عجائب گھر	برٹش میوزیم (لندن)
گنبد	گول گنبد (بیجاپور انڈیا)
ڈیلٹا	سندربن (پاکستان)
بند	سکھر بیراج (پاکستان)
جزیرہ	گرین لینڈ
ریلوے اسٹیشن	سنٹرل ٹرمینل (امریکا)

(منیر احمد بھٹی)
جھنگ

تمہارا خیال ہے

ایک چیز کی کمی

نونہال ملا، پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ سب مضمون اور کہانیاں مزے دار تھیں۔ ہمارا یہ نونہال دن بدن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے، لیکن اس میں ایک چیز کی کمی ہے، وہ یہ کہ اس میں لطیفے بھی ہونے چاہییں۔ اُمید ہے میری رائے سے بہن بھائی اتفاق کریں گے۔

رقیہ شبانہ انجم۔ کھلنا

نام سے بھی اچھا

ایک ہفتہ ہوا آپ کے ہمدرد نونہال کا پہلی بار مطالعہ کیا۔ بہت پسند آیا۔ مبارک باد قبول کیجیے گا۔ آپ بچّوں کی تعلیمی و ادبی دل چسپی کے لیے اپنے پرچہ کے نام یعنی "ہمدرد نونہال" سے بڑھ کر مواد شائع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

حسرت انصاری۔ ملتان

معما اور سالنامہ

جولائی ۱۹۶۵ء کا نونہال ملا۔ مچھلیوں نے بڑے پیار سے خوش آمدید کہا۔ نہایت پیارا ٹائٹل تھا۔ کہانیاں بہت ہی عمدہ تھیں۔ نظموں میں "ارادے" بہت پسند آئی۔

اب نونہال چند سال پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو گیا ہے۔ اس کی تعریف کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کیوں کہ یہ اپنی تعریف آپ ہے۔ "موتیوں کا صندوق" بہت پسند آیا۔

بہت سے بہن بھائیوں کا مطالبہ ہے کہ نونہال میں کسی تعلیمی معمے کا آغاز کیا جائے، لیکن آپ اس پر توجہ ہی نہیں دیتے۔ نہ جانے آپ کو نونہالوں کا یہ مطالبہ ہی پسند نہیں۔ یہی تو ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ آپ معمہ کے بارے میں ضرور اور جلد کوئی اعلان کریں۔ اور ایک مطالبہ سالنامہ کا بھی ہے۔ وہ بھی آپ کو پورا کرنا چاہیے۔ دیکھیں کب تک پورا ہوتا ہے۔

ملک خالد جاوید صیاد۔ کوئٹہ

نونہالوں کی تصویریں

گزشتہ ۲ سال سے میں ہمدرد نونہال پڑھ رہی ہوں۔ پہلے بھی اچھا تھا، مگر اب تو اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

مجھے تعجب ہے کہ ہمدرد نونہال اتنی جلدی کتنی ترقی کر گیا ہے۔ کسی چیز کی بھی تو کمی نہیں ہے۔ خدا ہمارے رسالے کو اور بھی ترقی دے۔ آمین۔ اس کے علاوہ میں اور بھی رسالوں کا مطالعہ کرتی ہوں، لیکن اتنا مفید اور دل چسپ کسی کو نہ پایا۔

سچ کہتی ہوں ہر ایک مضمون لاجواب تھا۔ اس کے علاوہ "ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟" یہ سلسلہ بڑا مفید ہے۔

قلمی دوستی کے ساتھ ساتھ نونہالوں کی تصاویر چھاپنے کا بھی انتظام شروع کر دیجیے۔ اب آخر میں میری خواہش یہ ہے کہ اگر آپ ہمدرد نونہال میں معمے کا سلسلہ شروع کر دیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

شہناز۔ سلہٹ

ہماری معلومات بڑھائیے

آپ کا رسالہ تو ماشاء اللہ اب ترقی کے زینوں پر چڑھتا جا رہا ہے

اور اس کا رنگ روپ پہلے کی بہ نسبت کافی نکھر گیا ہے۔ سب سے اچھی کہانیاں "برف۔ ہوا" "مچھلی کا شکار"، "امیر تیمور" اور "عجیب بٹوارا" لگیں۔ نظمیں تو تقریباً سب بہت اچھی تھیں۔ "یہ کراچی ہے" بھی پسند آیا۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں دوسرے شہروں کے بارے میں بھی شائع فرمائیں گے۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ مختلف ممالک کے سربراہوں کے متعلق مضامین شائع کریں۔ اس سے ایک تو ہماری معلومات بڑھے گی اور دوسرے یہ کہ ہمیں دنیا کے ملکوں کے متعلق کافی چیزیں معلوم ہو سکیں گی۔

محمود منظور۔ کراچی

پاکستان کا سب سے اچھا رسالہ

ہمدرد نونہال ملا۔ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی کہانیاں اور نظمیں بہت اچھی تھیں۔ ان میں خاص طور پر "ماں کی خوشنودی" "خوب صورت بہادر چیتا"، "صحبت کا اثر" بہت اچھی تھیں۔ آپ کا رسالہ بہت ترقی کر رہا ہے۔ یہ پاکستان کا سب سے اچھا رسالہ ہے۔ امید ہے ابھی یہ اور ترقی کرے گا۔

محمد فیض۔ کوئٹہ

انعامی مشاغل

ویسے تو ہمارا پیارا "ہمدرد نونہال" تمام رسائل سے بلند ہے، مگر پھر بھی اس میں ایک چیز کی کمی محسوس کی جا رہی ہے اور جس پر ابھی تک کوئی عمل نہیں ہوا۔ وہ ہیں انعامی مشاغل۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اس رائے کو ضرور مدنظر رکھا جائے گا۔

اختر متین۔ کوٹ سمابہ

دلی دُعا

زندگی میں پہلی بار ہمدرد نونہال پڑھا۔ اس کو جتنا اچھا پایا ہے یہ

صرف میں ہی جانتا ہوں۔ صرف ایک کمی ہے کہ اس میں بچوں کے لیے کوئی چھوٹا موٹا معمّا نہیں ہے۔ اگر یہ کمی پوری ہو جائے تو رسالے کو چار چاند لگ جائیں۔ میری دلی دعا ہے کہ رسالہ ہمدرد نونہال دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین

شہزادہ منظور قادر۔ ٹانڈلیانوالہ

انعامی مشغلہ

نونہال نظر سے گزرا دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیاں اور نظمیں سب اچھی تھیں سرورق بھی اچھا تھا۔ بھائی جان اب آپ رسالے میں ایک چیز کا اضافہ کردیں وہ یہ کہ کوئی مشغلہ جاری کردیں جس پر کچھ انعام ہو۔ امید ہے دیگر نونہال بہن بھائی اس رائے سے اتفاق کریں گے۔ نونہال ہر طرح سے اچھا ہے۔ میں اسے سب رسائل میں اوّل نمبر خیال کرتا ہوں۔

شوکت علی
پشاور

پہلے نہیں دیکھا

میں کافی عرصہ سے ہمدرد نونہال کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ہمدرد نونہال بہت سی خوبیوں کا مالک ہے اور آپ ہی کی محنت کا نتیجہ ہے کہ ہم اس بیش قیمت رسالے سے بہت سی اچھائیاں حاصل کرتے ہیں۔ ہمدرد نونہال ایسا رسالہ ہے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور آپ نے اس رسالے میں "نونہال ادیب" کے صفحات رکھ کر ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

محمد اسحاق زاہد۔ ملتان

چار چاند

ہمدرد نونہال نظر سے گزرا خوبصورت ٹائٹل دیکھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا۔ اس سے پہلے ہمدرد نونہال کو اتنا خوبصورت نہیں دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ تو اس بات کی خوشی ہوئی کہ آپ نے نونہال کے ٹائٹل پر چکنا کاغذ لگا دیا۔ جس سے ہمدرد نونہال میں چار چاند جڑ گئے۔

عتیق الرحمٰن۔ ڈھاکہ

اِن الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

آثار : اثر کی جمع، علامات، انداز، نشان
آرائش : بناؤ، سنگھار
آرزو : تمنا، خواہش
اصرار : تاکید کرنا، تکرار
التجا : خوشامد، گزارش، درخواست
ایجاد : نئی چیز بنانا
برچھی : چھوٹا بھالا
بلوائی : غل شور فتنہ فساد کرنے والے
تمدن : رہنے کا انداز
جوشن : بازو پر باندھنے کا زیور
حائل : بیچ میں آنے والا، روک
حسد : جلن، کسی کی ترقی کا برا چاہنا
خلعت : وہ کپڑا جو بادشاہوں یا امیروں کی طرف سے انعام میں دیا جائے۔
خودغرض : مطلبی، اپنا مطلب چاہنے والا
دربان : پہرے دار، چوکیدار
دمک : چمک
رہبری : راستہ بتانا،
زوال : کمی، ترقی کا جاتا رہنا
سُکھ : آرام، تندرستی

سہولت : آسانی
شائستہ : تعلیم یافتہ، سیدھا جو شرارت نہ کرے
عروج : چڑھنا، بلند ہونا۔
کائنات : دنیا
کتبہ : وہ عبارت جو قبر یا مسجد وغیرہ کے پتھر پر کندہ کرتے ہیں۔
گالا : صاف کی ہوئی تھوڑی سی روئی، جس کا گولہ سا بنا لیتے ہیں، نرم
گام زن : تیز رفتار۔
گریز : پرہیز، بھاگنا
گم صم : خاموش، حیران، گونگا، بہرا
گھروندا : مٹی کا چھوٹا سا گھر، جو لڑکیاں لڑکیاں کھیلنے کے لیے بناتی ہیں۔
گہوارہ : بچوں کو سلانے یا بہلانے کا جھولا
لہولہان : خون میں تھڑا ہوا
محاذ : مقابلہ کرنے کی جگہ
معاش : وہ چیز جس سے گزر بسر کی جائے
مگن : خوش، مست
نقارہ : ڈھول
نکھرنا : صاف ہونا، اچھا اجلا ہونا

حلقۂ دوستی

مختار احمد سومرو - شکارپور

عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ریڈیو سننا

پتہ: معرفت عبدالجبار دکاندار صدیق مارکیٹ شکارپور

امتیاز ایوب شیخ - میانوالی

عمر: ۱۷ سال تعلیم: ایف ایس سی

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ مضامین لکھنا

پتہ: ۱۴/سی محلہ بنوں خیل۔ میانوالی

محمد نعیم الحق - سیالکوٹ

عمر: ۱۲ سال تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ٹکٹ جمع کرنا

پتہ: حق اسٹیشنری مارٹ لہائی بازار، سیالکوٹ

ملک عبدالحفیظ پنخوردی - کراچی

عمر: ۱۷ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ٹکٹ جمع کرنا

پتہ: راشن شاپ نمبر ۱۰۲۶ دریا آباد کراچی نمبر ۲

شہزادہ خلیل احمد ساحلی - ڈیرہ اسماعیل خان

عمر: ۱۳ سال - تعلیم: ششم

دل چسپیاں: مضمون نگاری کرنا

پتہ: گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۲ ڈیرہ اسماعیل خان

محمد سلیم - نواب شاہ

عمر: ۱۶ سال - تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ مطالعہ

پتہ: معرفت ریاض سوپ ورکس نواب شاہ

محمد اعجاز دلشاد - لاہور

عمر: ۱۷ سال - تعلیم: فرسٹ ایر

دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ مطالعہ

پتہ: مکان نمبر ۳۳ رام گلی نمبر ۲ لاہور

سید نظام الدین زاہد - پشاور شہر

عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ہاکی کھیلنا

پتہ: مکان نمبر ۲۱۴ محلہ دونی چند پشاور شہر

فلک شیر خان مجمل درانی۔ ڈیرہ غازی خان

عمر: ۱۴ سال - تعلیم۔ دہم

دل چسپیاں: شعر کہنا۔ فوٹو گرافی۔

پتہ: گورنمنٹ ہائی اسکول وہوا۔ ڈیرہ غازی خان

رفاقت حسین صدیقی۔ ڈھاکہ

عمر: ۱۱ سال - تعلیم چہارم

دل چسپیاں: مطالعہ کرنا

پتہ: گرین کو ٹیج جدہ پور۔ ڈسٹرکٹ۔ ڈھاکہ

رشید احمد - کراچی

عمر: ۱۳ سال تعلیم: پنجم

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا۔

پتہ: منگھو پیر گرم کشتی اسکول ڈاک خانہ کراچی

جاوید آفتاب - ملتان

عمر: ۱۴ سال - تعلیم: نہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، فوٹو جمع کرنا

پتہ: بے-۲ ۱۵ سیو پورہ۔ اکبر روڈ۔ ملتان

ہلال احمد - بہاولپور

عمر: ۱۰ تعلیم: قرآن حفظ کرنا

دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا

پتہ: بے/۱۴۹۔ جی۔او۔ کالونی۔ ماڈل ٹاؤن، بی، بہاولپور

ایم۔ اسلم چوہدری۔ احمد پور شرقیہ

عمر: ۱۲ سال - تعلیم دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، ناول پڑھنا

پتہ: پبلک ہائی اسکول محمد نوشہ بخاری۔ احمد پور شرقیہ

رحمت اللہ ابرہیم - حیدرآباد

عمر: ۱۴ سال - تعلیم: ششم

دل چسپیاں: رسالے پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا

پتہ: مکان نمبر ۱۰۷۲- ۱۹/بی۔ وڈوانی گلی شاہی بازار۔ حیدرآباد مغربی پاکستان

محمد رفیق ہمدرد - شیخوپورہ

عمر: ۱۵ سال: تعلیم: دہم

دل چسپیاں: قلمی دوستی

پتہ: مالک ہمدرد کتب خانہ ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ

مسٹر بابر - شیخوپورہ

عمر: ۱۰ سال - تعلیم: چہارم

دل چسپیاں: نونہال پڑھنا

پتہ: معرفت ہمدرد کتب خانہ ننکانہ صاحب شیخوپورہ

ایم کمال - کراچی

عمر: ۱۱ سال - تعلیم: ششم

دل چسپیاں: قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا

پتہ: اشرف ہاؤس ۱۷۱ اے ۲ بلاک ۲ طارق روڈ، کراچی ۲۹

محمد یوسف - حیدرآباد

عمر: ۱۲ سال - تعلیم چہارم

دل چسپیاں: کتابیں پڑھنا۔

پتہ: سنار گلی ۲۸۹۶ خلیلی روڈ۔ حیدرآباد

جاوید اقبال محمد - لاہور
عمر: ۱۷ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: معرفت چوہدری محمد اسماعیل ورکس کلرک
آف پی۔ڈبلیو آئی رائے ونڈ ضلع لاہور

سید حیدر مصطفیٰ - ڈھاکہ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، فٹ بال
پتہ: ۱۴۵/۱۴۷ حاجی عثمان غنی روڈ۔ڈھاکہ

حیدر نواب - ڈھاکہ
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، فوٹوگرافی
پتہ: ۱۶ لال موہن شاہا اسٹریٹ۔ ڈھاکہ

سلیم رضا - کوئٹہ
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: ۱۸۵- میکانگی روڈ ظفر منزل۔کوئٹہ

سید اخلاق محمود شاہ - فورٹ سنڈیمن
عمر: ۱۳ سال - تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: اخلاق بکڈپو تھانہ روڈ - فورٹ سنڈیمن

لیاقت علی - رحیم یار خاں
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: مکان ۵۸/اے مہاجر کالونی رحیم یار خاں

ظہور الحق شمسی - پیلی بھیت
عمر: ۱۸ سال تعلیم: انٹرمیڈیٹ
دل چسپیاں: قلمی دوستی، بیڈمنٹن
پتہ: میسرز بناسپتی اسٹور، پیلی بھیت۔
(یو پی) انڈیا

محمد سعید اختر - لورالائی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی اور شکار
پتہ: معرفت ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ
ہائی اسکول بارکھان۔ضلع لورالائی

منظور احمد ظفر - لائل پور
عمر: ۱۵ سال تعلیم: نہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی
پتہ: چک نمبر ۲۵ گ ب انوکھر وال
براستہ رجانہ ضلع لائل پور

سید محمد غیاث الدین - لاہور
عمر: ۱۷ سال تعلیم دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: مکان نمبر ۱ گلی نمبر ۲۱ (رلیٹھ بلڈنگ) ۲۵
غنی محلہ سنت نگر - لاہور۔

مرزا شاہد علی بیگ - حیدر آباد
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرنا
پتہ: مرزا غفار علی بیگ مکان نمبر ۲۱ شاہ لطیف آباد
یونٹ نمبر ۸ حیدر آباد مغربی پاکستان

چوہدری مشتاق احمد ندیم - جھنگ
عمر: ۱۸ سال - تعلیم: انٹر
دل چسپیاں: قلمی دوستی - مطالعہ
پتہ: گورنمنٹ وول سپننگ اینڈ ویونگ کم
ٹریننگ سنٹر کالج - جھنگ شہر

مصوّر موسیٰ - کراچی
عمر: ۱۱ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: معرفت کارپیٹ ایکسپورٹ
ٹھاکورڈوارا لائن - کراچی نمبر ۲

وقار احمد - راولپنڈی
عمر: گیارہ سال - تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: رسالے پڑھنا - ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: گورنمنٹ ہائی اسکول - خانس پور -
ایوبیہ - ڈاک خانہ - ریالہ - ضلع راولپنڈی

عبدالستار عادل - گوادر
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: قلمی دوستی، سائیکل
پتہ: گورنمنٹ ہائی اسکول - گوادر

. . . .

فارم حلقۂ دوستی

نام: . . . .
عمر: . . . .
تعلیم: . . . .
دل چسپیاں: . . . .
پتہ: . . . .
. . . .

حکیم حافظ محمد سعید ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے زین پیکیجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

دانتوں کی تکلیف کا
ایک علاج

ستمبر ۱۹۶۵ء
رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

نونہال

نواں شمارہ
بارھویں جلد

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے —————— سالانہ آٹھ روپے

PRINTED AT ZAIN PACKAGING INDUSTRIES LTD. KARACHI